ماہنامہ

اشراق

لاہور

نومبر ۲۰۰۹

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

''دین میں قسم کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ عہد پورا کرنا اسلام کے بنیادی اخلاقیات میں سے ہے۔ اِس سورہ کی ابتدا اسی تاکید سے ہوتی ہے۔ قسم اِس عہد کو بالکل آخری درجے میں محکم کر دیتی ہے۔ مسلمان جب اپنے کسی عزم، ارادے یا عہد پر اللہ کی قسم کھاتا ہے تو وہ گویا اپنے پروردگار اور عالم کے پادشاہ کو اپنی بات پر گواہ ٹھیراتا ہے۔''

——— قرآنیات

دارالاشراق

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۲۱ شمارہ ۱۱ نومبر ۲۰۰۹ ذوالقعدہ ۱۴۳۰ھ

فی شمارہ ۲۰ روپے
سالانہ ۲۰۰ روپے
زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ
بیرون ملک
۱۰۰۰ روپے
زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ

فہرست

شذرات — جاوید احمد غامدی — ۲
حلال و حرام

قرآنیات — جاوید احمد غامدی — ۵
المائدہ (۱۸)

معارف نبوی — طالب محسن — ۱۱
ستاروں کا اثر ماننا

دین و دانش — خورشید احمد ندیم — ۱۷
دینی مدارس، سماج اور ریاست

اصلاح و دعوت — ریحان احمد یوسفی — ۲۵
کیا اللہ اور خدا، الگ الگ ہیں؟

یسئلون — شعبہ مذہبی امور (دنیا ٹی وی) — ۳۱
متفرق سوالات

وفیات — محمد عمار خان ناصر — ۴۱
شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدر
(شخصیت اور فکر و مزاج کے چند نمایاں نقوش)

المورد

51 کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ 54700 ۔ فون: 5834306, 5865145 (042) ۔ فیکس 5864856 (042)
Web Site: www.ghamidi.org E-mail: ishraq@ghamidi.org

جاوید احمد غامدی

حلال و حرام

زینت کا لفظ عربی زبان میں اُن چیزوں کے لیے آتا ہے جن سے انسان اپنی حس جمالیات کی تسکین کے لیے کسی چیز کو سجاتا بناتا ہے۔ چنانچہ لباس، زیورات وغیرہ بدن کی زینت ہیں؛ پردے، صوفے، قالین، غالیچے، تماثیل، تصویریں اور دوسرا فرنیچر گھروں کی زینت ہے؛ باغات، عمارتیں اور اِس نوعیت کی دوسری چیزیں شہروں کی زینت ہیں، موسیقی آواز کی زینت ہے؛ شاعری کلام کی زینت ہے۔ دین کی صوفیانہ تعبیر اور صوفیانہ مذاہب تو اِن سب چیزوں کو مایا کا جال سمجھتے اور بالعموم حرام یا مکروہ یا قابل ترک اور ارتقاے روحانی میں سد راہ قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ وہ اِن مذاہب کی تردید کرتا اور پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں جائز ہیں، بلکہ نہایت سخت تنبیہ اور تہدید کے انداز میں پوچھتا ہے کہ کون ہے جو زینت کی اِن چیزوں کو حرام قرار دینے کی جسارت کرتا ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں:

قُلْ، مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ. (الاعراف ۷:۳۲)	''اِن سے کہو، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور کھانے کی پاک چیزیں کس نے ممنوع ٹھیرا دی ہیں۔''

پھر یہی نہیں، وہ اعلان کرتا ہے کہ رزق کے طیبات اور زینت کی یہ سب چیزیں تو اِس دنیا میں پیدا ہی اہل ایمان کے لیے کی گئی ہیں، لہٰذا اصلاً اُنھی کا حق ہیں، خدا کے منکروں کو تو یہ اُن کی طفیل اور اُس مہلت کی وجہ سے ملتی ہیں جو دنیا کی آزمایش کے لیے اُنھیں دی گئی ہے۔ چنانچہ آخرت میں یہ تمام تر اہل ایمان کے لیے خاص ہوں گی، منکروں کے لیے اِن میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، وہ اِن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے جائیں گے:

قُلْ، هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	''یہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے

خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ، كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷:۳۲)

ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتاً اُنھی کے لیے ہوں گی۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں اپنی آیتوں کی اِسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔''

قرآن کا یہ اعلان ایک حیرت انگیز اعلان ہے۔ عام مذہبی تصورات اور صوفیانہ مذاہب کی تعلیمات کے برخلاف قرآن دینی زندگی کا ایک بالکل ہی دوسرا تصور پیش کرتا ہے۔ تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کے لیے دنیا کی زینتوں سے دست برداری کی تلقین کے بجاے وہ ایمان والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ اسراف وتبذیر سے بچ کر اور حدود الٰہی کے اندر وہ زینت کی سب چیزیں بغیر کسی تردد کے استعمال کریں اور خدا کی اِن نعمتوں پر اُس کا شکر بجالائیں:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ، خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ، وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا، اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ. (الاعراف ۷:۳۱)

''آدم کے بیٹو، ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو، مگر اسراف نہ کرو، اِس لیے کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اِس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی شریعت میں حرام پھر کیا چیزیں ہیں؟ اِس سوال کا جواب قرآن نے سورۂ اعراف میں آگے اِسی مقام پر یہ دیا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اللہ نے صرف پانچ چیزیں حرام قرار دی ہیں: ایک فواحش، دوسرے حق تلفی، تیسرے ناحق زیادتی، چوتھے شرک اور پانچویں بدعت۔

خدا کی شریعت میں یہی چند چیزیں حرام ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ حلال وحرام کے معاملے میں یہ خدا کا اعلان ہے، لہٰذا کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اِن کے علاوہ کسی چیز کو حرام ٹھیرائے۔ چنانچہ اب اگر کوئی چیز حرام ہوگی تو اُسی وقت ہوگی، جب اِن میں سے کوئی چیز اُس میں پائی جائے گی۔ روایتیں، آثار، حدیثیں اور پچھلے صحیفوں کے بیانات، سب قرآن کے اِسی ارشاد کی روشنی میں سمجھے جائیں گے۔ اِس سے ہٹ کر یا اِس کے خلاف کوئی چیز بھی قابل قبول نہ ہوگی۔ فرمایا ہے:

قُلْ، اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ، وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا، وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ.

(الاعراف ۷:۳۳)

''اِن سے کہہ دو کہ میرے رب نے تو صرف فواحش کو حرام کیا ہے — خواہ کھلے ہوں یا چھپے — اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اِس کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراؤ جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے اور اِس کو کہ تم اللہ پر افترا کر کے کوئی ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ المائدہ

(۱۸)

(گذشتہ سے پیوستہ)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا، اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۸۷﴾ وَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا، وَّاتَّقُوا

ا۔ایمان[۱۹۰] والو، جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمھارے لیے جائز کی ہیں[۱۹۱]، اُنھیں حرام نہ ٹھیراؤ[۱۹۲] اور نہ حدود سے تجاوز کرو[۱۹۳]۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا[۱۹۴]۔ جو حلال و طیب چیزیں اللہ نے تمھیں

۱۹۰؎ اپنے مضمون کے لحاظ سے سورہ یہاں ختم ہوئی۔ اِس سے آگے اب اُسی طرح ایک ضمیمہ ہے، جس طرح سورۂ نساء کے آخر میں ہے۔ اِس میں اللہ تعالیٰ نے اُن سوالوں کا جواب دیا ہے جو اِس سورہ کے مباحث سے متعلق لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔ اِن میں سے ہر سوال کا جواب 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے خطاب سے شروع ہوتا ہے۔ قرآن نے سوالات نقل نہیں کیے، اِن کا جواب، البتہ ایک ترتیب کے ساتھ دیا ہے اور درمیان میں اشارہ بھی کر دیا ہے کہ یہ لوگوں کے سوالات ہی ہیں جن کا جواب اِس ضمیمے میں دیا گیا ہے۔ نساء اور مائدہ توام سورتیں ہیں۔ اِن کے خاتمے کی یہ مماثلت بتاتی ہے کہ قرآن میں سورتیں کس کس پہلو سے توام ہوتی ہیں۔

پہلا سوال آیات ۱-۲ میں عہد و پیمان کی پابندی کی تمہید کے بعد یہ بتانے سے پیدا ہوا ہے کہ چند مستثنیات کے سوا تمام چوپائے حلال ٹھیرائے گئے ہیں۔ لوگوں نے پوچھنا چاہا ہے کہ اگر اللہ کے نام پر باندھے گئے عہد و پیمان کی

اللّٰہَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِہٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ،

بخشی ہیں، اُنھیں کھاؤ پیو اور (اپنے) اُس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ (تم میں سے بعض لوگ کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، سو جان لو کہ) اللہ تمھاری اُن قسموں پر کوئی

اہمیت دین میں اِس درجہ غیر معمولی ہے تو کوئی شخص اگر شریعت کی حرمتوں کے علاوہ کسی چیز کو اپنے اوپر حرام ٹھیرانے کی قسم کھا بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

دوسرا سوال اِنھی آیات سے یہ پیدا ہوا ہے کہ اِن میں بیان کردہ حرمتوں کے سوا اگر ہر چیز حلال ہے تو شراب اور جوے کے بارے میں کیا ہدایت ہے؟ اِس سوال کا جواب اگر یہ ہے کہ یہ دونوں حرام ہیں تو جو لوگ اِس سے پہلے اِن چیزوں میں ملوث رہے ہیں، اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟

تیسرا سوال بھی اِنھی آیات میں حالت احرام کے شکار کی حرمت کے ذکر سے پیدا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اِس حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو اُس کو کیا کرنا چاہیے؟ نیز یہ کہ احرام کی حالت میں سمندر کے شکار کا کیا حکم ہے؟ اِس لیے کہ سمندر کے سفر میں تو بعض اوقات شکار کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

چوتھا سوال بھی اِنھی آیات سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدی، قلائد اور اِسی طرح کے دوسرے شعائر کی حرمت اِن آیتوں میں بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ اِس سے یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ کے نام سے جن جانوروں کی حرمت قدیم زمانے سے مذہبی رسوم کی بنا پر مسلم چلی آرہی ہے، اُن کے متعلق اب آخری فیصلہ کیا ہے؟ ہدی اور قلائد کی طرح اُن کی یہ حرمت بھی قائم ہے یا ختم کر دی گئی ہے؟

پانچواں اور آخری سوال کتمان شہادت کے اُس رویے پر قرآن کے تبصرے سے پیدا ہوا ہے جو خدا کی شریعت اور آخری بعثت کے معاملے میں یہود و نصاریٰ اختیار کیے ہوئے تھے۔ لوگوں کو تشویش ہوئی ہے کہ اِس کے بعد وہ اپنی وصیت پر گواہی کے لیے کیا اہتمام کریں؟ یہ اُن سوالوں میں سے ہے جو کسی بات کے ذکر سے ذہن کے دوسری طرف منتقل ہو جانے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

۱۹۱؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ بعض چیزیں فی الاصل پاکیزہ ہیں، مگر کوئی خارجی سبب بعض اوقات ایسا پیش آجاتا ہے جس سے اُن کو خباثت لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً، ایک جانور حلال ہے، لیکن اُس کو ذبح نہیں کیا گیا یا ذبح تو کیا گیا ہے، مگر اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیا گیا ہے۔

۱۹۲؎ اِس سے مراد کسی چیز کو اِس دعوے کے ساتھ ممنوع ٹھیرانا ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے یا نیکی اور فضیلت حاصل

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ

مواخذہ نہ کرے گا جو تم بے ارادہ کھا لیتے ہو[195]، لیکن جو قسمیں دل کے پختہ ارادے سے کھاتے ہو، اُن پر ضرور مواخذہ کرے گا[196]۔ (سو اِس طرح کی قسم اگر توڑ دی جائے) تو اُس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو اُس

کرنے کا ذریعہ ہے یا اِس پر عذاب و ثواب مترتب ہو سکتا ہے۔ اِس میں زیادہ دخل مشرکانہ عقائد و اوہام کو ہوتا ہے۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اِس طرح کے کسی ادعا یا گمان کے بغیر کسی چیز کے کھانے سے اجتناب بھی اِسی کے تحت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگر اِس قسم کی کوئی بات نہ ہو، بلکہ مجرد ذوق یا باقتضاے صحت یا بربناے احتیاط و کفایت کسی چیز کا استعمال کوئی شخص ترک کر دے تو یہ چیز تحریم میں داخل نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن ۲/۵۸۸)

۱۹۳؎ یہ الفاظ یہاں 'حرام نہ ٹھیراؤ' کے مقابل میں آئے ہیں، اِس لیے مدعا یہ ہے کہ پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھیراؤ اور حلال و حرام کے معاملے میں اللہ کے قائم کردہ حدود سے تجاوز کر کے اُس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنا لینے کی جسارت بھی نہ کرو۔

۱۹۴؎ قرآن میں اِس تعبیر سے بالعموم اِس کا لازم مراد ہوتا ہے، یعنی اُن سے نفرت کرتا ہے۔

۱۹۵؎ قسم بعض اوقات بالکل لغو، بے فائدہ اور مہمل ہوتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ بندۂ مومن کو اِس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے، لیکن اپنے بندوں پر یہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں عنایت ہے کہ وہ اِس طرح کی قسموں پر دنیا اور آخرت میں کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔

۱۹۶؎ دین میں قسم کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ عہد پورا کرنا اسلام کے بنیادی اخلاقیات میں سے ہے۔ اِس سورہ کی ابتدا اِسی تاکید سے ہوتی ہے۔ قسم اِس عہد کو بالکل آخری درجے میں محکم کر دیتی ہے۔ مسلمان جب اپنے کسی عزم، ارادے یا عہد پر اللہ کی قسم کھاتا ہے تو وہ گویا اپنے پروردگار اور عالم کے پادشاہ کو اپنی بات پر گواہ ٹھیراتا ہے۔ انسانی تمدن میں تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی معاملات اور معاہدوں میں استحکام کا ذریعہ ہمیشہ سے قسم ہی رہی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ قسم اگر پختہ عزم کے ساتھ اور دل کے ارادے سے کھائی گئی ہے، اُس کے ذریعے سے کوئی عہد و پیمان باندھا گیا ہے، اُس سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہوتا ہے یا وہ خدا کی کسی تحلیل و تحریم پر اثر انداز ہو سکتی ہے تو اُس پر اللہ تعالیٰ لازماً مواخذہ فرمائے گا۔

اَوۡسَطِ مَا تُطۡعِمُوۡنَ اَهۡلِيۡكُمۡ اَوۡ كِسۡوَتُهُمۡ اَوۡ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ، فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ. ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيۡمَانِكُمۡ اِذَا حَلَفۡتُمۡ، وَاحۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ، لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۸۹﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا، اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ، لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا يُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِى الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ، وَيَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ

معیار کا کھانا کھلایا جائے جو تم عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا اُنھیں پہننے کے کپڑے دیے جائیں یا ایک غلام آزاد کیا جائے۔ پھر جسے یہ میسر نہ ہو، اُس کے لیے تین دن کے روزے ہیں۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھا بیٹھتے ہو۔[۱۹۷] (اِسے ادا کرو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اللہ اِسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم اُس کے شکر گزار رہو۔[۱۹۸] ۸۷-۸۹

۲۔ ایمان والو، یہ شراب[۱۹۹] اور جوا اور تھان اور قسمت کے تیر، سب گندے شیطانی کام ہیں، سو اِن سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جوے میں لگا کر تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے[۲۰۰] اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔[۲۰۱] پھر کیا (اِن چیزوں سے) باز

۱۹۷؎ قسم کی جو اہمیت اوپر بیان ہوئی ہے، اُس کے باوجود بارہا ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ آدمی کے لیے اپنی قسم پوری کرنا ممکن نہیں رہتا یا وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس سے اللہ کا یا اُس کے نفس کا یا دوسروں کا کوئی حق تلف ہو جائے گا۔ آیت سے واضح ہے کہ اِس صورت میں قسم توڑی جا سکتی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں قسم توڑ دینا دین و اخلاق کی رو سے ضروری ہو جاتا ہے۔ کفارے کا یہ طریقہ اِسی مقصد سے مقرر کیا گیا ہے۔

۱۹۸؎ اِس سے واضح ہے کہ یہ توضیحی آیات ہیں جو اِس سورہ کے مباحث سے متعلق پیدا ہونے والے بعض سوالوں کے جواب میں نازل ہوئی ہیں۔ اِن کے بعد اگلی آیت سے دوسرے سوال کا جواب شروع ہو جاتا ہے۔

۱۹۹؎ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ سے واضح ہے اور عقل عام بھی یہی کہتی ہے کہ شراب کی حرمت میں اصل علت اُس کے اندر نشے کا پایا جانا ہے۔ اِس وجہ سے ہر نشہ آور چیز کا حکم یہی ہوگا اور سد ذریعہ کے اصول پر اُس کی مقدار قلیل بھی

الصَّلٰوةِ، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا،
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ

آتے ہو؟[۲۰۲] (اِن سے باز آجاؤ) اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اور (نافرمانی سے) بچتے رہو۔ لیکن (ہماری اِس ہدایت سے) منہ موڑو گے تو جان لو کہ ہمارے پیغمبر پر تو اِس کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وضاحت کے ساتھ پہنچا دے[۲۰۳]۔ (تم میں سے) جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور اچھے عمل

اُسی طرح حرام ہوگی، جس طرح مقدار کثیر حرام ہے۔

۲۰۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'فِی الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ'۔ اِن میں 'فی' انہماک واشتغال کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ جوے اور شراب سے لوگوں کے درمیان دشمنی اور انتقام کی آگ کس طرح بھڑکتی ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... یہ حقیقت ہے کہ جس معاشرے میں یہ وبا پھیل جائے، اُس میں یا تو عفت، عزت، ناموس اور وفا وحیا کا احساس مٹ جائے گا، جیسا کہ مغرب زدہ سوسائٹی میں آج مشاہدہ ہو رہا ہے اور یہ بجائے خود ایک عظیم حادثہ ہے اور اگر اِن کی کوئی رمق باقی رہے گی تو ناگزیر ہے کہ آئے دن اِن کی بدولت تلواریں کھنچی رہیں۔ عرب عفت وعصمت، خودداری اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے اور یہ اِن کی بہت بڑی خوبی تھی، لیکن ساتھ ہی شراب اور جوے کے بھی رسیا تھے، اِس وجہ سے جام وسنداں کی یہ بازی اُن کے لیے بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔ جہاں کسی نے شراب کی بدمستی میں کسی کے عزت وناموس پر حملہ کیا، کسی کی تحقیر کی، کسی کو چھیڑا یا جوے میں کوئی چیند کی (اور یہ چیزیں جوے اور شراب کے لوازم میں سے ہیں)، وہیں تلواریں سونت لیتے اور افراد کی یہ لڑائی چشم زدن میں قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی اور انتقام در انتقام کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا کہ صرف مہینے اور سال نہیں، بلکہ پوری صدی گزار کر بھی یہ آگ ٹھنڈی نہ پڑتی۔" (تدبر قرآن ۲/۵۹۰)

۲۰۱؎ خدا کی یاد کے بعد نماز کا ذکر عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ جوا اور شراب انسان کو خدا سے غافل کرتے ہیں اور انسان خدا سے غافل ہو جائے تو اُس پر شیطان مسلط ہو کر رہتا ہے۔ اُس کی گرفت سے بچنا پھر اُس کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شیطان اُسے خواب دکھاتا اور زندگی کی اصل حقیقتوں سے رودررو ہونے کی جرأت اُس کے اندر سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

کرنے لگے ہیں، اُنھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے، جب کہ اُنھوں نے تقویٰ اختیار کیا، ایمان لائے اور اچھا عمل کرتے رہے، پھر مزید یہ کہ تقویٰ اختیار کیا اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے، پھر یہی نہیں، تقویٰ اختیار کیا اور (خدا کے ہر حکم پر) خوبی کے ساتھ عمل پیرا ہوئے۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ خوبی کا رویہ اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[۲۰۴] ۹۰-۹۳

۲۰۲؎ استفہام یہاں امر کے مفہوم میں ہے۔ امر کا سادہ اسلوب اختیار کرنے کے بجائے استفہام کا یہ اسلوب کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس اسلوب میں امر کے ساتھ زجر، موعظت، تاکید و تنبیہ اور اتمام حجت کا مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں غور کیجیے تو اسلوب کلام اِس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ شراب اور جوے کے مفاسد کی تفصیل اتنے مختلف مواقع پر اور اتنے مختلف پہلوؤں سے تمھارے سامنے آ چکی ہے کہ اب اِس معاملے میں کسی کے لیے بھی کسی اشتباہ کی گنجایش باقی نہیں رہی ہے تو بتاؤ، اب بھی اِس سے باز آتے ہو یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ امر کے سادہ اسلوب میں یہ سارا مضمون نہیں سما سکتا تھا۔'' (تدبر قرآن ۲/۵۹۱)

۲۰۳؎ یعنی پیغمبر کا فرض پورا ہو گیا۔ اِس کے بعد تمھاری ذمہ داری ہے۔ نہیں سمجھتے تو اِس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہو۔

۲۰۴؎ یہ ایک ضمنی سوال کا جواب ہے کہ شراب اگر ایسی ناپسندیدہ چیز ہے تو اُن لوگوں کا کیا ہو گا جو اِس سے پہلے پیتے رہے ہیں یا پیتے تھے اور اِس دوران میں وفات پا چکے ہیں؟ اِن لوگوں کے لیے تو اب توبہ واصلاح کا بھی کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ قرآن نے اِس کا جواب دیا ہے کہ اِس طرح کے معاملات میں اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے بغیر گرفت نہیں کرتے۔ چنانچہ جو لوگ ہر حال میں تقویٰ پر قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کی تمام ہدایات پر ایمان و اخلاص کے ساتھ عمل کرتے رہے ہیں، اُن سے اُن چیزوں کے کھانے پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا جو اُنھوں نے اُس وقت کھائی تھیں، جب اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ اپنا حکم بیان نہیں کیا تھا۔

[باقی]

طالب محسن

ستاروں کا اثر ماننا

عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّهُ قَالَ: صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلاَةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى إِثْرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلَةِ. فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ: هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِي مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ. فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ، فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ. وَأَمَّا مَنْ قَالَ: بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا، فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِيْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ.

حضرت زید بن خالد جہنی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کی بارش کے بعد حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی۔ پھر جب آپ نے سلام پھیرا تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا: جانتے ہو، تمھارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ لوگوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی جانتے ہیں۔ (آپ نے فرمایا) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میرے بندوں میں سے کچھ نے میرے اوپر ایمان اور کچھ نے میرے انکار پر صبح کی ہے۔ چنانچہ جس نے کہا ہے کہ ہم پر اللہ کے فضل اور رحمت سے بارش ہوئی ہے، یہ میرے اوپر ایمان رکھنے والا اور ستاروں کا منکر ہے۔ اور جس نے کہا ہے کہ

فلاں فلاں ستارے کے اثر سے بارش ہوئی ہے تو وہ میرا منکر اور ستاروں کا ماننے والا ہے۔

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَلَمْ تَرَوْا إِلٰى مَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالَ: مَا أَنْعَمْتُ عَلٰى عِبَادِي مِنْ نِعْمَةٍ إِلَّا أَصْبَحَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِهَا كَافِرِيْنَ. يَقُوْلُوْنَ: الْكَوَاكِبُ وَبِالْكَوَاكِبِ.

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگوں نے نہیں دیکھا کہ تمھارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟ فرمایا ہے: میں جب بھی کوئی نعمت عطا کرتا ہوں تو بندوں میں سے کچھ اس کے سبب کافر ہو جاتے ہیں۔ کہنے لگ جاتے ہیں: یہ ستارے ہیں، یہ ستاروں کے سبب سے ہے۔

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ بَرَكَةٍ إِلَّا أَصْبَحَ فَرِيْقٌ مِّنَ النَّاسِ بِهَا كَافِرِيْنَ. يُنْزِلُ اللّٰهُ الْغَيْثَ. فَيَقُوْلُوْنَ: الْكَوْكَبُ كَذَا وَكَذَا.

فِيْ حَدِيْثٍ: بِكَوْكَبِ كَذَا وَكَذَا.

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب بھی آسمان سے کوئی برکت نازل کرتے ہیں تو لوگوں میں سے کچھ اس کی وجہ سے کافر ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتے ہیں، لیکن یہ کہتے ہیں کہ فلاں اور فلاں ستارہ ہے۔

ایک روایت میں ہے: فلاں اور فلاں ستارے کے سبب سے ہے۔

عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) قَالَ: مُطِرَ النَّاسُ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى

اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: أَصْبَحَ مِنَ النَّاسِ شَاکِرٌ وَمِنْھُمْ کَافِرٌ. قَالُوا ھٰذِہِ رَحْمَۃُ اللّٰہِ. وَقَالَ بَعْضُھُمْ: لَقَدْ صَدَقَ نَوْءُ کَذَا وَکَذَا. قَالَ: فَنَزَلَتْ ھٰذِہِ الْآیَۃُ: فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ، حَتّٰی بَلَغَ: وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ اَنَّکُمْ تُکَذِّبُوْنَ.

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بارش ہوئی تو آپ نے فرمایا: لوگوں میں سے کچھ شاکر اور کچھ کافر ہو گئے۔ کچھ نے کہا: یہ اللہ کی رحمت ہے اور کچھ نے کہا: یہ فلاں اور فلاں ستارے کے سبب سے ہے۔ کہتے ہیں: اس موقع پر (الواقعہ ۵۶: ۷۵-۸۲ کی) یہ آیات نازل ہوئیں: 'فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ' سے 'وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ اَنَّکُمْ تُکَذِّبُوْنَ' تک۔

لغوی مباحث

'إثر سماء': 'سماء' کا مطلب ویسے تو آسمان ہے، بارش چونکہ اوپر سے آتی ہے، اس لیے اس کی نسبت آسمان کی طرف کر دی جاتی ہے۔ یہاں بھی 'سماء' کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ 'إثر' کا لفظ پیچھے یا بعد کے معنی میں آتا ہے۔

'نوء': 'نوء'، 'ناء' کا مصدر ہے۔ اس کا مطلب بوجھ سے جھکنے کا ہے۔ ستاروں کی نسبت سے یہ فعل ستاروں کے فجر کے وقت مغرب کی سمت نیچے جانے کے لیے بھی آتا ہے۔ پھر اسی سے یہ لفظ محض ستاروں کے غروب و طلوع کے لیے استعمال ہو جاتا ہے۔ یہاں مصدر فاعل کے معنی میں آیا ہے۔

'مَوٰقِعِ النُّجُوْمِ': ستاروں کے مواقع سے ان کی جگہ یا مقامات بھی مراد ہو سکتے ہیں اور ان کے گرنے کی جگہ یا ہدف بھی اس کا مطلب ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ دوسرے معنی مراد ہیں۔

معنی

ان روایات کا موضوع ایک ہی ہے۔ اس دنیا میں ظاہر ہونے والے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے اذن اور ارادے کے تحت ہیں۔ انسان کی بدبختی یہ ہے کہ وہ اس کو جاننے اور ماننے کے باوجود مختلف ہستیوں، ستاروں، جگہوں اور اوقات کو موثر مانتا ہے۔ ستاروں کی گردش ہو یا مختلف اوقات یا اشیا کا سامنے آنا ہو، وہ اس سے مستقبل کے اندازے

قائم کرتا اور انھی اشیا کے حوالے سے غیب جاننے کے درپے رہتا ہے۔ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں علم غیب کی نفی کی ہے اور کئی اسالیب میں یہ بات جگہ جگہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ مستقبل کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ زندگی، موت، رزق، اولاد اور پیش آمدہ حالات کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے جبت کو ممنوع قرار دیا ہے۔ جبت کا مطلب یہ ہے کہ ہم مختلف مادی مظاہر یا مادی اشیا میں ایسا اثر مانیں جو مادی نہ ہو۔ مثلاً تیرہ کے ہندسے کی نحوست، کوے کے بولنے سے مہمانوں کا آنا مراد ہونا، ہاتھوں کی لکیروں اور ستاروں کی گردش سے نحس وسعد کو سمجھنا وغیرہ۔ قرآن مجید نے اس کو شرک اور شیطان کی پیروی کے ساتھ متعلق کر کے بیان کیا ہے جس سے اس کی شناعت واضح ہوتی ہے۔ غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ توہم پرستی اور شرک ایک ہی خاندان کے جرائم ہیں۔

ستاروں کی گردش سے حالات وواقعات کو منسوب کرنا کم وبیش ہر معاشرے میں رائج ہے۔ عرب معاشرے میں بھی یہ بات رائج تھی۔ روایت میں بیان کردہ صورت اس رویے کا ایک مظہر ہے۔ ستاروں کا طلوع وغروب اور ان کا افق پر جگہوں کو تبدیل کرنا بہت حد تک زمین کی سورج کے گرد گردش کی وجہ سے ہے۔ یہی گردش سورج سے زمین کے فاصلے کے کم وبیش ہونے اور دن اور رات کے طول میں فرق کا باعث ہے جس سے موسموں میں تبدیلی آتی ہے۔ لیکن بات اس سے آگے بڑھتی ہے اور اسی گردش سے مقدر کے الٹ پھیر کو وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے اس روایت میں کفر قرار دیا گیا ہے۔

شارحین روایت نے ستاروں کے ظہور وغیوب کو موثر بالذات ماننے کو غلط قرار دیا ہے اور اسے موسموں کے الٹ پھیر کو سمجھنے کی علامت قرار دینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی کا یہ اعتقاد ہو کہ فلاں ستارہ فلاں چیز کے ظاہر ہونے کا خود باعث ہے تو یہ چیز غلط ہے، لیکن اگر وہ کسی ستارے کے سامنے آنے سے یہ سمجھ لے کہ اب فلاں موسم شروع ہونے والا ہے تو یہ بات غلط نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک بھی یہ فرق درست ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمان سے رزق خدا بھیجتا ہے، اس میں اصل چیز خدا کا فیصلہ ہے اور خدا کے فیصلوں کو ستاروں اور اشیا سے متعلق سمجھنا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے اور اس کی حقیقی قدرت اور عظمت نہ پہچاننا ہے، یہی چیز ہے جو اسے کفر سے ملا دیتی ہے۔

ان روایات میں سے ایک روایت میں قرآن مجید کی ایک آیت کا حوالہ بھی موجود ہے۔ سورۂ واقعہ کی ان آیات کے سیاق سے واضح ہے کہ یہ آیت ستاروں کے گرنے کو قرآن کی حفاظت کے انتظام کے شاہد کے طور پر پیش کر رہی

ہے۔قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر یہ بات بیان ہوئی ہے کہ شیاطین جب سن گن لینے کے لیے اوپر جاتے ہیں تو ان پر سنگ باری ہوتی ہے، یہی سنگ باری ہے جسے یہاں اور دوسرے مقامات پر ستاروں کے گرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ محض لفظی مناسبت سے اس آیت کو موضوع زیر بحث سے جوڑ دیا گیا ہے۔قرآن مجید کے اس مقام کا زیر بحث موضوع سے تعلق جوڑنا تکلف سے خالی نہیں۔

متون

امام مسلم نے اس روایت کے چار متن دیے ہیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی واقعے کے مختلف بیانات ہیں۔کسی نے تفصیل سے بات بیان کی ہے اور کسی نے مختصر۔کسی نے بیان کا پس منظر بھی بیان کر دیا ہے اور کسی نے روایت کو محض اصولی بات کے بیان تک محدود رکھا ہے۔ کچھ روایات میں قرآن مجید کی سورۂ واقعہ کی آیات بھی بطور استدلال منقول ہیں۔اس کے علاوہ فرق محض لفظی ہیں۔امام مسلم نے جو جملے چار روایتوں کی صورت میں روایت کیے ہیں، دوسری کتب حدیث میں بعض جملے ایک دوسرے متن سے تبدیل بھی ہو گئے ہیں۔

کتابیات

بخاری، رقم ۸۱۰، ۹۹۱؛ مسلم، رقم ۱۷–۳۷؛ ابن حبان، رقم ۱۸۸، ۶۱۳۲؛ ابوداؤد، رقم ۳۹۰۶؛ ترمذی، رقم ۳۲۹۵؛ نسائی، رقم ۱۵۲۴؛ سنن کبریٰ، رقم ۱۸۳۳–۱۸۳۶، ۱۰۷۵۹، ۱۰۷۶۱؛ سنن بیہقی، رقم ۲۸۵۳، ۶۲۴۳، ۶۲۴۴؛ مسند احمد بن حنبل، رقم ۹۴۴۴، ۸۷۲۴، ۸۷۹۷، ۱۷۰۷۶، ۱۷۱۰۲، ۱۷۰۹۰؛ المعجم الکبیر، رقم ۵۲۱۳، ۵۲۱۵، ۱۲۸۸۱؛ موطا مالک، رقم ۴۵۱؛ الادب المفرد، رقم ۹۰۷۔

خورشید احمد ندیم

دینی مدارس، سماج اور ریاست

دینی مدارس کے سماجی کردار اور ان میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں حکومت اور معاشرہ دونوں تذبذب اور تشکیک میں مبتلا ہیں۔ اربابِ اقتدار ایک ہی سانس میں ان کی معاشرتی خدمات کی تعریف کرتے اور ساتھ ہی ان کی چار دیواری سے ''دہشت گرد'' برآمد کرتے ہیں۔ معاشرے کے صاحبانِ وسائل اور عام افراد، دونوں ان اداروں کے سماجی رویے کے شاکی ہیں لیکن ساتھ ہی مذہبی معاملات میں ان مدارس کے فارغ التحصیل اہلِ علم کی آرا کو مستند خیال کرتے اور اس حوالے سے ان ہی کی طرف رجوع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کے وجود کو اپنی دینی ضرورت سمجھتے ہوئے ان کی آبادی اور توسیع کے لیے وسائل فراہم کرتے ہیں۔

تذبذب اور تشکیک پر مبنی کسی پالیسی اور رائے کا انجام بخیر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر اس معاملے میں کسی فیصلہ کن اقدام سے پہلے معاشرتی اور حکومتی سطح پر ذہنی یک سوئی ضروری ہے۔ اس تذبذب اور تشکیک کا یہ نتیجہ ہے کہ حکومت کے فیصلے نیم دلانہ ہیں جن میں استمرار ہے نہ تیقن۔ چنانچہ اگر اصلاح کے نام پر کوئی قدم اٹھتا ہے تو وہ بھی ایک نیا ابہام پیدا کرتا ہے۔

اس وقت ہمیں اس معاملے کو صرف دینی حوالے ہی سے نہیں، سماجی اعتبار سے بھی سمجھنا ہے کیونکہ دینی مدارس کا وجود ہمارے معاشرتی ماحول پر بعض غیر معمولی اثرات مرتب کر رہا ہے۔ اس باب میں چند امور اگر بطور مقدمہ پیشِ نظر رہیں تو مسئلے کی تفہیم آسان ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر:

دینی تعلیم ہماری معاشرتی ضرورت ہے۔ کوئی ایسا معاشرہ جس کی کم و بیش ستانوے فی صد آبادی مسلمان ہو، وہ اپنے دینی تشخص کے معاملے میں بے پروا نہیں ہو سکتا۔ ہر مسلمان گھرانہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ اس کے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت ہو تاکہ وہ ایک مسلمان کی زندگی گزار سکیں۔

تعلیمی نظام میں دینی و غیر دینی کی تقسیم مسلمان معاشرے کے لیے ہمیشہ ایک اجنبی تصور رہا ہے۔ تخصّص (Specialization) تو بلاشبہ ہوتا تھا، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اپنی بنیاد کے اعتبار سے بعض تعلیمی ادارے دینی ہوں اور بعض غیر دینی۔ یہ معلوم ہے کہ ہمارے ہاں اس کا آغاز اس وقت ہوا جب انگریز یہاں کے حکمران بنے اور انھوں نے ریاستی سطح پر تعلیم کے ایسے نظام کو فروغ دیا جس میں مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ مسلمان معاشرے کی اس ضرورت کو پورا کرنے اور دینی ورثے کی حفاظت کے لیے بعض اہلِ خیر نے جو اہتمام کیا، اس کا نتیجہ یہ دینی مدارس ہیں۔ ایسی کاوشوں کے نتیجے میں ہندوستان کا مسلمان معاشرہ زندہ رہا اگرچہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد ہونا یہ چاہیے تھا کہ تعلیم کی اس دوئی کا خاتمہ کر دیا جاتا تاکہ ایک قوم بننے کا عمل سہل ہو جاتا اور ہمارا اجتماعی وجود یوں ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہوتا۔ بہ وجوہ ایسا نہیں ہو سکا۔ ریاست کی سطح پر جب اس اہم ضرورت کو نظر انداز کیا گیا تو حسبِ سابق معاشرے نے اس نظامِ تعلیم کی سرپرستی جاری رکھی۔ اس طرح دینی مدارس ایک متبادل نظامِ تعلیم کے طور پر نہ صرف موجود رہے بلکہ پھلتے پھولتے رہے۔

مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا تو بلا مبالغہ لاکھوں افراد مختلف حوالوں سے ان سے وابستہ ہو گئے۔ سماجیات کے عمومی اصولوں کے تحت ان کی حیثیت ایک ''طبقے'' کی ہو گئی اور پھر فطری نتیجے کے طور پر طبقاتی مفاد وجود میں آ گیا۔ اب ایک طرف کچھ لوگوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی کہ وہ اس طبقاتی مفاد کا دفاع کریں گے اور دوسری طرف وہ گروہ سامنے آئے جنھوں نے مدارس کی اس اجتماعی قوت سے اپنے دنیاوی اور مادی مفادات کی آبیاری کی۔ یہ گروہ ریاست اور سیاسی علما تھے۔

ریاست نے جس طرح ان مدارس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا، اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں لیکن ''جہاد افغانستان''، ''طالبان'' اور ''جہادِ کشمیر'' شاید اس کے سب سے بڑے مظاہر ہیں۔ یہ استعمال درست تھا یا غلط، یہ سوال اس تجزیے سے براہ راست متعلق نہیں، یہاں اس پہلو کو بطورامرِ واقعہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کس طرح ریاست نے اپنے مقاصد کے لیے اس اجتماعی قوت سے فائدہ اٹھایا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی آمد کے بعد جو جنگ ہوئی، وہ گوریلا جنگ تھی۔ اس میں تربیت یافتہ فوج کے ساتھ، گوریلا کارروائیوں کے لیے ''مجاہدین'' کی ضرورت بھی تھی۔ پاکستانی ریاست کے اس اقدام کو مغربی دنیا کی بھرپور حمایت حاصل تھی کیونکہ مغرب اس معرکے میں سوویت یونین کی فیصلہ کن شکست کا آرزومند تھا۔ بعد میں میں جب پاکستان نے افغانستان میں ایک ''پاکستان

حامی‘‘(Pro-Pakistan)حکومت کا خواب دیکھا تو ’’طالبان‘‘ کو میدان میں اتارا گیا۔کشمیر کا معاملہ یہ تھا کہ بعض بین الاقوامی پابندیوں اور بھارت کے ساتھ دوطرفہ معاہدوں کے باعث، ریاست کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ علانیہ کوئی اقدام کرے۔ریاست نے اس کے لیے جو متبادل پالیسی بنائی،اس میں قرعہ فال پھر مدارس کے نام نکلا۔

سیاسی علما نے ان مدارس کو اپنے حلقۂ انتخاب کی حیثیت دے دی۔سیاست کے لیے عصبیت ناگزیر ہے۔اس وقت میدانِ سیاست میں جو لوگ بروئے کار ہیں، وہ کسی نہ کسی عصبیت پر کھڑے ہیں۔یہ عصبیت حلقۂ انتخاب سے لے کر قومی سطح تک پھیلی ہوئی ہے۔کہیں یہ برادری ہے، کہیں لسانی شناخت ہے، کہیں علاقائیت ہے اور کہیں نسلی وابستگی۔گروہی مفاد بھی ایک سیاسی عصبیت ہے، جیسے سرمایہ داری یا جاگیر دار طبقے کی نمایندگی۔جو ’’علما‘‘ سیاسی مقاصد رکھتے تھے، ان کے پاس اس نوعیت کی عصبیت موجود نہیں تھی۔انھوں نے ان مدارس کی مذہبی عصبیت کو اپنی سیاسی بنیاد بنا لیا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔یہ کامیابی ان معنوں میں نہیں ہے کہ وہ اپنے علانیہ یا تحریری منشور کے مطابق ریاست کا نظام دے پائے بلکہ سیاسی معنوں میں ہے۔یعنی وہ اقتدار کی حریفانہ کشمکش میں ایک مؤثر فریق کے طور پر سامنے آئے اور ’’حصہ بطورِ جثہ‘‘ لینے میں کامیاب ہوئے۔

بعض اہل علم نے کوشش کی کہ وہ اپنے مدارس کو سیاسی علما کی دسترس سے محفوظ رکھ سکیں اور اپنا کردار حسبِ سابق ادا کرتے رہیں۔یہ کردار روایتی دینی علم کا دفاع اور معاشرے کی دینی ضروریات کے لیے افراد کی فراہمی ہے۔تاہم یہ ادارے اب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

دینی مدارس کا نصاب جوہری طور پر مسلکی و گروہی ضروریات کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا ہے۔یہاں سے فارغ التحصیل علما معاشرے میں کسی خاص مسلک کے مبلغ کے طور پر سرگرم رہتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مساجد مسلکی اور فقہی بنیادوں پر منقسم ہیں۔

اس وقت دینی مدارس کی تعلیم اور ماحول سے معاشرے میں تقسیم کا عمل بہت گہرا ہو گیا ہے۔ایک دینی مدرسے کا فارغ التحصیل یا طالب علم اپنے ظاہر، بود و باش، اطوار و عادات، معاشرتی رویے اور مشاغل کے اعتبار سے سماج کے دیگر طبقات سے یکسر مختلف دکھائی دیتا ہے۔دینی مدارس کی اس روایت، سماجی کردار اور پاکستانی معاشرے کی دینی ضروریات کو پیشِ نظر رکھیں تو چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

ریاست اور سیاسی علما کے ہاتھوں دینی مدارس کے سوءِ استعمال کے بعد اب معاشرہ ان کے بارے میں ابہام اور تشکیک میں مبتلا ہے، تاہم وہ یہ بھی خیال کرتا ہے کہ معاشرے کی دینی ضروریات متقاضی ہیں کہ یہ نظام باقی رہے۔

معاشرے کی دینی ضروریات، اس وقت تین طرح کی ہیں۔

۱۔ بچوں کے لیے روزمرہ کی دینی تعلیم۔

۲۔ نکاح وطلاق، ولادت وموت، حضانت ووراثت جیسے مسائل میں دینی احکام سے آگاہی وتکمیل۔

۳۔ مساجد کا انتظام وانصرام۔

معاشرہ دینی مدارس کے کردار سے مطمئن نہیں، لیکن اس کے پاس اپنی دینی ضروریات کی تکمیل کے لیے کوئی متبادل انتظام نہیں ہے۔ وہ بادلِ نخواستہ اسے قبول کیے ہوئے ہے۔ ریاست اس بات سے بڑی حد تک آگاہ ہو چکی کہ دینی مدارس کے باب میں اس سے ایک مجرمانہ غلطی سرزد ہوئی ہے اور اب اس حکمتِ عملی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ مدارس چونکہ اب ایک سماجی طبقہ ہے جس سے لوگوں کے مفادات وابستہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے اس طبقے کی طرف سے کسی ردِعمل کے خوف سے، وہ دینی مدارس کے بارے میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے گریزاں ہے۔ وہ دینی مدارس کی تنظیموں کو حیلوں بہانوں سے قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ساتھ ہی ان کی ناراضی کا خوف بھی اس کا دامن گیر ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے؟ ریاست اور معاشرہ اس تذبذب اور تشکیک سے کیسے باہر نکلیں؟

ہمارے نزدیک اس کا ایک طویل المدتی حل ہے اور ایک قلیل المدتی۔

۱۔ طویل المدتی حل کے لیے چند اقدامات ناگزیر ہیں۔

دوئی پر مبنی اس نظام کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ ملک میں ایک ہی نصابِ تعلیم ہو جو بارہ سال کی ابتدائی تعلیم پر مبنی ہو۔ اس میں جس طرح سماجی اور طبیعی علوم ایک خاص سطح تک سکھا دیے جاتے ہیں، اسی طرح دینی علوم کی بھی تدریس کی جائے۔

میڈیکل کالجز اور انجینئرنگ یونیورسٹیز کی طرز پر اعلیٰ دینی تعلیم کے ادارے قائم کیے جائیں تاکہ بارہ سال کی بنیادی تعلیم کے بعد جس طرح ڈاکٹر اور انجینئر تیار ہوتے ہیں، اس طرح لوگ دین کے عالم بھی بنیں۔

آج جس طرح حکومت ماہرین کی مدد سے جامعات اور پیشہ ورانہ تعلیم کا نصاب بناتی ہے، جو سارے ملک میں رائج ہوتا ہے، اسی طرح دینی علوم کے ماہرین کی معاونت سے دین کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی نصاب بنائے، جو ظاہر ہے، کسی خاص مسلک یا فقہ پر مبنی نہ ہو، بلکہ قرآن وسنت کی بنیاد پر ہماری دینی روایت کا احاطہ کرتا ہو۔ اس سے فرقہ وارانہ تلخی بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔

نجی سطح پر بھی اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی اجازت ہونی چاہیے، تاہم ان پر نصاب اور تعلیمی ماحول کے حوالے سے وہ تمام پابندیاں عائد ہونی چاہییں جن کا التزام اس وقت نجی جامعات یا سماجی و طبیعی علوم کے اداروں کے لیے ضروری ہے۔

عالمِ اسلام کے تمام ممالک کی طرح مساجد کا اہتمام و انصرام ریاست اپنی تحویل میں لے لے۔ مسجد کے قیام سے لے کر امام و خطیب کی تعیناتی تک، تمام امور حکومتی سرپرستی میں طے کیے جائیں۔ نجی سطح پر مسجد کے قیام اور امام کی تعیناتی جیسے معاملات پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔

اگر ریاست چاہے تو پانچ سال کی منصوبہ بندی سے اس نظام کو فروغ دے سکتی ہے۔ اس ضمن میں پہلا مرحلہ یہ ہوگا کہ رائے عامہ اور معاشرتی طبقات کو اعتماد میں لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے لازم ہے کہ معاشرے کے سنجیدہ رائے ساز طبقات، جو اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں، وہ عامۃ الناس کو قائل کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ دوسری طرف اس حوالے سے حکومتی سطح پر ہونے والی ہر پیش رفت پارلیمنٹ کی معرفت کی جائے، اسے عوامی نمایندوں کو تائید حاصل ہونی چاہیے۔

۲۔ چونکہ اس وقت ملک میں مدارس کا ایک مؤثر نظام موجود ہے، اس لیے اس کو نظر انداز کر کے یا اعتماد میں لیے بغیر کوئی اقدام نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ اس لیے سرِ دست بعض فوری اقدامات کی بھی ضرورت ہے۔ اسے ہم قلیل المدتی منصوبہ قرار دیتے ہیں۔

اس وقت دینی مدارس کے حوالے سے کوئی قدم اٹھاتے وقت ان کی پانچ نمایندہ تنظیموں کو اعتماد میں لیا جائے۔

مساجد چونکہ اس وقت مسلکی بنیاد پر قائم ہیں، اس لیے یہ اہتمام کیا جائے کہ ہر مسلک کی مسجد میں متعلقہ وفاق (تعلیمی بورڈ) کی طرف سے امام اور خطیب تعینات ہو۔ اگر وہ مذہبی حوالے سے کسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرے تو متعلقہ وفاق اس کا ذمہ دار ہو اور چاہے تو اس کو بدل دے۔

فوری طور پر کسی مسجد کی تعمیر کے لیے حکومتی اجازت لازم قرار دے دی جائے۔

دینی مدارس کے اب تک فارغ التحصیل تمام افراد کے لیے مختصر دورانیے، مثلاً تین ماہ کے، کورسز ترتیب دیے جائیں۔ ان میں سماجی و طبیعی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور کمپیوٹر وغیرہ کی تعلیم دی جائے اور اس کمی کو ممکن حد تک دور کرنے کی سعی کی جائے، جو اس وقت دینی اداروں کے نصاب اور تعلیمی ماحول میں موجود ہے۔ ان کورسز میں شرکت کو سرکاری ملازمتوں وغیرہ کے لیے لازمی قرار دیا جائے۔ یہ کورسز مختلف جامعات یا وزارتِ تعلیم کے تحت

منظّم کیے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ سرکاری وغیر سرکاری علمی وتحقیقی اداروں کو یہ ذمہ داری سونپی جاسکتی ہے۔کورسز کی کامیاب تکمیل پر حکومت اس کی سند جاری کرے۔

ہماری حکومتیں وقتاً فوقتاً بعض اقدامات اٹھاتی رہی ہیں جن کا تعلق مدارس کے تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے سے ہے۔مثال کے طور پر کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے حکومت نے ایک موقع پر مدارس کو اساتذہ اور کمپیوٹر کی فراہمی کا اعلان کیا۔ اس طرح کے اقدامات کو مزید مؤثر بنایا جائے۔

حکومت اس کا اہتمام کرے کہ عالمِ اسلام کے دیگر ممالک میں قائم دینی تعلیمی اداروں کے ساتھ ان مدارس کے طلبہ واساتذہ کا مؤثر رابطہ قائم ہوتا کہ وہ اس سے آگاہ ہوں کہ معاصر اسلامی دنیا میں دینی تعلیم وتحقیق کا کام کس نہج پر آگے بڑھ رہا ہے۔

اس نوعیت کا ربط وضبط عام تعلیم کے ملکی اداروں کے ساتھ بھی بڑھایا جائے۔اساتذہ اور طلبہ ایک دوسرے کے ساتھ ملیں تاکہ فاصلوں میں کمی آئے۔ مدارس کے مختلف بورڈز کے طلبہ کے مابین بھی اس طرح کا تعلق قائم ہونا چاہیے۔

آج مدارس میں بعض ایسے لوگ موجود ہیں جوان کے سماجی کردار سے مطمئن نہیں۔ وہ ان کے نصاب اور تعلیمی ماحول، دونوں کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ایسے حضرات کو تلاش کیا جائے اور انھیں اس حوالے سے فعال بنایا جائے۔

ذرائع ابلاغ اس بات میں بہت مؤثر ثابت ہوسکتے ہیں۔ضرورت ہے کہ سول سوسائٹی اور میڈیا مل کر دینی تعلیم کے نظام کو بہتر بنانے میں اپنا کردار کریں۔

جس طرح عمومی تعلیم کے اداروں کو روایتی سیاست دانوں سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے، اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ دینی مدارس کو سیاسی علما سے بچایا جائے۔حکومت، ان مدارس کے ذمہ داران اور معاشرے کے دیگر طبقات کو، جو ان مدارس کو وسائل مہیا کرتے ہیں، مل کر اس بارے میں کوئی حکمت عملی ترتیب دینا ہوگی۔ صاحبانِ وسائل انھی اداروں کی معاونت کریں جو دینی تعلیم کے لیے خاص ہوں اور حکومت، پارلیمنٹ کی مدد سے ایسے اقدامات کرے جو تعلیم کے تمام دینی وعمومی اداروں کو مذہبی وغیر مذہبی سیاست دانوں سے محفوظ رکھ سکیں۔

قلیل المدتی منصوبہ کسی گھمبیر مسئلے کا پائیدار حل نہیں ہوتا، زیادہ نقصان سے بچنے کی ایک وقتی تدبیر ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا اجتماعی دینی تشخص برقرار رہے اور ہم مذہب کے سوء استعمال کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکیں تو لازم ہے کہ طویل المدتی منصوبہ بنا کر اس مسئلے سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کی جائے۔ دینی مدرسوں

کے ذمہ داران کو بھی بہت سنجیدگی کے ساتھ سوچنا ہوگا کہ ہر معاشرے میں دین تک رسائی بالعموم اہلِ مذہب کی معرفت ہوتی ہے۔ اگر اس کو پیش کرنے والے اس کی حفاظت نہ کریں اور انسانی خواہشات کا گرد و غبار اسے اپنی لپیٹ میں لے لے تو مذہب کا حسن گہنا جاتا ہے۔ یہ واقعہ یورپ میں پیش آچکا۔ پاکستان میں یہ آواز تیز تر ہو رہی ہے کہ ریاست و اجتماعیت کو مذہبی اثرات سے محفوظ بنایا جائے۔ اس کے لیے تمام دلائل اہلِ مذہب کے رویے سے لیے جاتے ہیں۔ قرآن و سنت کی تعلیمات میں ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ کشش موجود ہے کہ اگر انھیں صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے رکھا جائے تو وہ اس کی طرف دوڑے چلے آئیں۔ اہلِ مذہب کو سوچنا ہوگا کہ اگر وہ مذہب کی طرف پیش قدمی میں رکاوٹ بنیں گے تو اللہ کے حضور میں، خدشہ ہے کہ انہیں سخت جواب دہی کا سامنا کرنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یومِ آخرت کی رسوائی سے محفوظ رکھے۔ آمین!

ریحان احمد یوسفی

کیا اللہ اور خدا، الگ الگ ہیں؟

ہمارے ہاں بعض حلقوں میں یہ خیال رائج ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے خدا کا لفظ استعمال کرنا غلط ہے۔ان میں سے بہت سے لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ خدا کا استعمال اس کی توہین کے مترادف ہے۔اس لیے ایسے لوگ اس معاملے میں بہت جذباتی بھی ہوجاتے ہیں۔ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر تۃً درتۃً غلط فہمیوں پر مشتمل ہے۔ پیش نظر مضمون میں ہم قرآن وحدیث اور زبان و بیان کے مسلمات کی روشنی میں اس مسئلے کا علمی جائزہ لے کر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن کا فیصلہ

اللہ تعالیٰ کا کیا نام درست ہے اور کیا نہیں، کس نام کو اس کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے اور کس کو نہیں، اس کا فیصلہ نزول قرآن کے وقت ہی ہوگیا تھا۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام 'الرحمٰن' بیان ہوا ہے۔الرحمٰن کا لفظ عربی زبان کا معروف لفظ تھا جس سے مشرکین عرب واقف تھے۔تاہم ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے وہ اللہ کا لفظ استعمال کرتے تھے۔جبکہ اللہ تعالیٰ کے نام کے طور پر الرحمٰن کا لفظ زیادہ تر اہل کتاب میں استعمال ہوتا تھا۔قرآن کریم نے بھی بعض مقامات پر اس نام کو اللہ تعالیٰ کے ذاتی نام کے طور پر استعمال کیا۔مثلاً سورہ الرحمٰن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

الرحمٰن نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے (الرحمٰن 1,2:55)

جب قرآن نے لفظ الرحمٰن کو استعمال کیا تو مشرکین عرب، جو مخالفت پر تلے بیٹھے تھے، انھوں نے اس بات کو اچھالنا شروع کر دیا۔قرآن کریم میں مشرکین کے ردعمل کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ الرحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں: الرحمٰن کیا ہے؟ کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کا تم

ہمیں حکم دیتے ہو؟ اور یہ چیز ان کی نفرت کو اور بڑھاتی ہے۔ (الفرقان 25:60)

یہ چونکہ توحید کا مسئلہ تھا، جس کی وضاحت قرآن کا بنیادی موضوع ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ اللہ کے سوا کسی اور نام سے ذات باری تعالیٰ کو پکارنا غلط ہے۔ فرمایا:

> اے نبی انھیں بتا دو تم اللہ کہہ کر پکارو یا الرحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔ (سورہ بنی اسرائیل 17:110)

یہ آیت اس مسئلے کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ دے دیتی ہے جو لفظ خدا کے حوالے سے آج درپیش ہے۔ یہ نص قطعی صاف بیان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف الرحمٰن کہہ کر پکارنا درست ہے بلکہ ہر وہ اچھا نام جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے لیے کسی زبان، علاقے یا قوم میں رائج ہے، اس نام سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا بالکل جائز ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص قوم یا علاقے کا رب نہیں، بلکہ رب العالمین ہے۔ اس کا تصور ہر گروہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا رہا ہے۔ لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مگر ان سب ناموں سے مراد ایک ہی ہستی ہوتی ہے، جسے اہل عرب نزول قرآن کے وقت اللہ کہتے تھے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے زمین کا تصور ہر قوم، گروہ اور علاقے میں پایا جاتا ہے۔ مگر ہر اہل عرب اسے ارض، انگریز ارتھ اور ہم لوگ زمین کہتے ہیں۔ کیا ان تین مختلف ناموں سے زمین کے تصور میں تبدیلی آ گئی؟ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح کی ہے۔ اب صرف ایک سوال کا جواب باقی ہے کہ کیا ہماری زبان میں 'خدا' کوئی اچھا لفظ ہے یا نہیں؟ اس کا جواب ہمیں لغت میں مل جاتا ہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ کی شائع کردہ اردو زبان کی سب سے بڑی اور مستند لغت میں خدا کے لفظ کے تحت لکھا ہے۔

> ''بندے کے مقابل، خالق کائنات کا ذاتی نام اور خود اس کی ذات جس کے صفاتی نام ننانوے ہیں اور جو اپنی ذات و صفات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا، وہ یکتا ہے اور اس کا مثل کوئی نہیں۔'' 8/460

کیا اس وضاحت کے بعد لفظ خدا کے استعمال کے بارے میں کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے؟ اردو لغت والوں نے لفظ خدا کے یہ معنی گھر بیٹھے تخلیق نہیں کیے ہیں۔ اہل زبان جب کبھی لفظ خدا کو زبان سے ادا کرتے، وہ جب خدا کی قسم کھاتے، وہ جب گواہ بناتے ہیں، ان کے ذہن میں اللہ کے سوا کسی اور کا تصور تک نہیں ہوتا۔ کسی زبان کی اصل سند اس کے اساتذہ کا کلام ہوتا ہے۔ دیکھیے کہ اردو زبان کے ائمہ کس طرح خدا کے لفظ کو اللہ تعالیٰ ہی کے

لیے استعمال کرتے ہیں۔ میر کا شعر ہے:

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غالب کہتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اقبال کہتے ہیں:

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

دور حاضر کے معروف نعت و ثنا خواں شاعر مظفر وارثی کی حمد کا یہ شعر تو بچے بچے کو یاد ہے:

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے
وہی خدا ہے، وہی خدا ہے

یہ اشعار جب سنے جاتے ہیں تو ذہن میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، کسی اور کا تصور تک نہیں ہوتا۔

انبیا کا طریقہ

سورہ بنی اسرائیل کی آیت اس بحث میں فیصلہ کن ہے۔ مگر ذرا اور آگے چلیے اور دیکھیے کہ انبیا کا کیا طریقہ تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا۔ یہ لفظ دو اجزا سے مرکب ہے۔ اِسر اور ایل۔ قدیم عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کو 'ایل' کے لفظ سے پکارا جاتا تھا۔ جبکہ اِسر کے معنی بندے کے ہیں۔ اس طرح ان کے لقب اسرائیل کا مطلب ہوا 'ایل' یعنی اللہ کا بندہ۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان عبرانی تھی۔ 86 برس کی عمر میں ان کے دعا کے جواب میں جب اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹا عطا فرمایا تو آپ نے ان کا نام اسماعیل رکھا۔ اس نام کا مطلب ہے کہ 'ایل' یعنی اللہ تعالیٰ نے سنا۔

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان انبیا کے زمانے پر اس بات پر کوئی نکیر نہیں کی بلکہ قرآن میں ان دونوں ناموں کا ذکر کر کے قیامت تک اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ کسی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے جو لفظ بھی رائج ہے، اللہ تعالیٰ کو وہ قبول ہے۔ چاہے وہ عربی لفظ ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا یونانی، اردو ہو یا فارسی۔ ساری زبانیں اللہ ہی کی

ہیں۔اسی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے لیے عربی کے علاوہ کسی اور زبان کے لفظ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہیں ہے وگرنہ لازماً قرآن ان پیغمبروں کے نام بدل کر استعمال کرتا یا انھی پیغمبروں کے زمانے میں ان کے ناموں کی تصحیح کرا دیتا۔

لفظ خدا کے 'شرعی' عیوب

عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لفظ خدا میں بڑی 'شرعی' قباحتیں ہیں۔مثلاً یہ غیراللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کی جمع بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ فارسی میں بدی کی طاقت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیئے لفظ خدا پر ان اعتراضات کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں۔اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں لفظ 'خدا' جب تنہا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد وہی ہستی ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں، جیسا کہ اوپر ہم نے اردو زبان میں خدا کے معنی کے تحت بیان کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ بدی کی طاقت کے لیے فارسی زبان میں لفظ اہرمن کا استعمال ہوتا ہے نہ کہ خدا کا۔خدا کا لفظ تنہا جب کبھی آتا ہے اس کے معنی کبھی بدی کے خدا کے نہیں ہوتے۔ تاہم اردو اور فارسی زبان میں لفظ خدا مالک ، بادشاہ اور آقا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس پس منظر میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لفظ خدا کے ساتھ کوئی اور لفظ ملتا ہے اور غیراللہ کے لیے استعمال ہو جاتا ہے۔جیسے فارسی میں بدی کی طاقت کو خدائے اہرمن کہتے ہیں۔اسی طرح اردو زبان میں میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔اسی طرح یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ خدا کے لفظ کی جمع بھی اردو زبان میں مستعمل ہے۔

مگر کیا ان وجوہات کی بنا پر لفظ خدا کا استعمال غلط ہو گیا؟ ہرگز نہیں۔قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے عربی کا ایک ایسا لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے، جس میں نہ صرف یہ سارے 'شرعی' عیب پائے جاتے ہیں، بلکہ کچھ مزید عیب ہیں جو لفظ خدا میں نہیں ہیں۔آیئے دیکھتے ہیں وہ کیا لفظ ہے۔

قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کو رب کہا گیا ہے۔قرآن وحدیث میں منقول بے شمار دعائیں اس لفظ سے شروع ہوتی ہیں مگر یہ لفظ انسان کے لیے عربی میں عام استعمال ہوتا ہے اور قرآن کریم نے بھی استعمال کیا ہے۔مثلاً سورہ یوسف میں ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام سے دو قیدیوں نے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے تعبیر دیتے وقت ان کے آقا کے لیے جو لفظ کہا، قرآن نے اس کے لیے 'رب' کا لفظ استعمال کیا۔

''اما احد کما فیسقی ربه خمراً''یوسف12:41)

تم میں ایک اپنے آقا کو شراب پلائے گا

اسی آیت سے ذرا قبل ہی اس لفظ کی جمع ''ارباب''، اہل مصر کے ان دیوی دیوتاؤں کے لیے استعمال کی گئی جنھیں اہل مصر پوجتے تھے:

ء ارباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهارَ(یوسف12:39)

کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ، جو سب پر غالب ہے۔

جمع کے علاوہ اس لفظ کی مونث بھی عربی میں مستعمل ہے جبکہ لفظ خدا کم از کم اس عیب سے تو بری ہے۔ایک بہت مشہور حدیث جسے حدیثِ جبریل کہا جاتا ہے،اس کے الفاظ ہیں۔

ان تلد الامة ربتها(مسلم رقم8)

یعنی قیامت کی ایک نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی۔

جب اس سب کے باجود قرآن نے بلا جھجک اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کیا ہے تو خدا کے لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرنے میں کیا چیز مانع ہے؟ یاد رہے کہ موجودہ اردو زبان میں یہ لفظ اب اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہو چکا ہے۔ جسے اس بات میں شبہ ہو وہ اپنے استاد، دفتر یا دکان کے مالک یا صدر مملکت کو اس لفظ سے پکارے اور دیکھے کہ ارد گرد کے لوگ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

مسئلہ دعوتِ دین کا ہے

ہمیں اس نقطہ نظر پر اس لیے اعتراض ہے کہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کو اپنا 'قومی' معبود قرار دینے کی سوچ کارفرما محسوس ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں اسلام کی دعوت کو نقصان پہنچنے کا امکان پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سوچ سے متاثر مسلمان جب دعوت دین کے لیے اٹھے گا تو کسی انگریز غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دیتے وقت اس کا اصل زور یہ بات بتانے پر صرف ہوگا کہ تم جس ہستی کو God کہتے ہو وہ بالکل غلط ہے۔ تمھیں میرے اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ اسی طرح وہ ایک ہندو سے کہے گا کہ تم ایشور کے ماننے والے ہو جبکہ تمھیں اللہ کو ماننا چاہیے۔ اس کے نتیجے میں دوسرا فریق یہ سمجھے گا کہ مجھے میرے معبود سے ہٹا کر کسی اور معبود کی طرف لایا جا رہا ہے۔ پھر اس کے دل میں ایک اجنبیت اور وحشت پیدا ہوگی اور عین ممکن ہے کہ یہی اجنبیت قبول حق کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔

یہی سبب ہے کہ انبیا کا طریقہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ کبھی نام پر بحث نہیں کرتے، شرک پر بحث کرتے ہیں۔

ان صفات پر بحث کرتے ہیں جو اللہ سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔ آپ قرآن میں کبھی اس گفتگو کو پڑھیے جو انبیا و رسل اور ان کی اقوام کے بیچ میں ہوئی ہے۔ اس میں سارا زور توحید کو منوانے پر ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ تمام رسول اپنی قوم کی زبان ہی بولتے تھے۔ (ابراہیم 4:14)۔ ان رسولوں کی اقوام اپنی زبان میں یقیناً اللہ تعالیٰ کو کسی نہ کسی نام سے پکارتی ہوں گی۔ وہ رسول بھی اسی نام سے اللہ کو پکارتے تھے۔ مگر وہ کہتے تھے کہ تم جسے رب العالمین مانتے ہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تنہا اسی کی عبادت کرو۔

آج ہمارے لیے بھی یہی طریقہ آئیڈیل ہے۔ اور ہم اس طریقے پر تب ہی عمل کر سکتے ہیں جب ہم ظواہر پرستی سے باہر نکل کر یہ جان سکیں کہ اللہ ایک ہے اور سارے اچھے نام اسی کے ہیں۔ پھر یہ ممکن ہوگا کہ ایک امریکی کو ہم یہ بتا سکیں گے کہ تم God کی عبادت کرتے رہو، لیکن اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ کسی کو اس کا بیٹا اور بیوی نہ قرار دو۔ ایک ہندو کو ہم بتا سکیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خالق کائنات ایشور ہی ہے مگر دیکھو اس کے ساتھ کسی دیوی دیوتا یا اوتار کو معبود نہ مانو۔

اس کے بعد وہ شخص جب اسلام قبول کر کے نماز پڑھے گا، قرآن پڑھے گا، دین کے مقرر کردہ دیگر اعمال ادا کرے گا تو وہاں وہ اللہ ہی کا نام لے گا۔ مگر یہ حق کسی کو نہیں کہ وہ اس کی زبان بدلوانے کی کوشش کرے۔ اسے اجازت ملنی چاہیے کہ وہ اپنی زبان میں اللہ کو جو چاہے کہہ کر پکارے۔ کیوں کہ سارے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ یہ حق اسے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور کوئی اس سے اس کا یہ حق نہیں چھین سکتا۔

متفرق سوالات

''دنیاٹی وی کے پروگرام''دین و دانش.....جاوید احمد غامدی کے ساتھ'' کے سوال و جواب کا انتخاب پیش خدمت ہے۔اس کی ترتیب اور تلخیص کا کام دنیاٹی وی کے شعبہ مذہبی امور نے انجام دیا ہے۔''

اسلام میں عورتوں اور مردوں کے درمیان تفریق

سوال: کیا دین نے عورتوں اور مردوں کے احکام میں فرق کیا ہے؟ بعض معاشروں میں عورتوں کے ساتھ تفریق کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے، مثلاً سعودی عرب میں عورتیں گاڑی نہیں چلاسکتیں۔ ہمارے ہاں کچھ گھرانوں میں اور برادریوں میں عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا، باوجود اس کے کہ شریعت نے اسے مقرر بھی کر دیا ہے۔

جواب: اگر ہم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا مطالعہ کریں تو ہمیں وہاں ایسی کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ اس طرح کی کوئی چیز نہ تو ارت میں ہے، نہ زبور وانجیل میں اور نہ ہی قرآن میں۔ دورنبوی میں تو خواتین جنگوں میں شریک ہوئی ہیں۔انھوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیے ہیں، وہ قافلوں کے ساتھ گئیں، تجارت کی، سر پر لکڑیوں کا گٹھا لاتی تھیں۔ یہی معاملہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے دور کا ہے۔آپ انجیل کو پڑھیے، اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ کس طرح خواتین ان سے گفتگو کرتی تھیں، ان کی مجالس میں شریک ہو رہی ہیں۔

دراصل اس بات کا بڑا تعلق اس کلچر سے ہوتا ہے جس میں اسلام پہنچتا ہے۔ وہ افغانستان میں پہنچے گا تو وہاں لوگ اپنے کلچر میں اس کی تعبیر کرلیں گے۔ وہ عرب میں ہوگا تو وہاں لوگ اپنے کلچر میں اس کی تعبیر کرلیں گے۔ ہمارے ہاں بھی بعض قوموں کے ایسے ثقافتی پس منظر رہے ہیں، جن سے یہ سب چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جب دین کے احکام پر بھی غور کرتے ہیں تو بسا اوقات اپنے ثقافتی پس منظر اور اپنے کلچر سے اوپر اٹھ کر غور نہیں کرتے۔

اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں جو شریعت دی ہے، اس کی بنیاد پر ہمارے ہاں قانون سازی کی جاتی ہے، اس قانون کو فقہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ یہ قانون سازی مذہبی پس منظر میں ہوئی ہے، اس لیے یہ انفرادی زندگی

پر بھی اثر انداز ہو جاتی ہے اور اس قانون سازی پر چونکہ تہذیب، کلچر اور رسوم و رواج بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اس وجہ سے بعض اوقات ایک بنیادی بات جو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہوتی ہے، جب وہ قانون سازی کے مختلف مراحل سے گزرتی ہے تو وہ یک سر ایک مختلف شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر بعض اوقات زمانے کی کچھ مصلحتیں بھی ہوتی ہیں، وہ بھی اس قانون سازی پر اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس سارے عمل سے جو ڈھانچا بنتا ہے، اس میں اس طرح کی چیزیں بہت غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں۔

اس معاملے کو جب ہم قرآن مجید کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو چند بنیادی مقدمات بالکل واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ قرآن مجید یہ اعلان کرتا ہے کہ مرد و عورت کے مابین انسان ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں آدم و حوا کی اولاد ہیں اور دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی مقصد سے پیدا کیا ہے۔ جب دنیا میں انسان ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں تو اس معاملے میں رشتے اور تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ تعلقات ہیں جن میں بعض اوقات حفظِ مراتب کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم خاندان کا ادارہ وجود میں لاتے ہیں تو ماں اور باپ کے رشتے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب ماں اور باپ میں خِلقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، لیکن اس سے ایک مرد کو والد اور ایک خاتون کو ماں کی جو حیثیت حاصل ہو گئی ہے، اس میں بھی حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان رشتوں میں کوئی چھوٹا ہو جاتا ہے اور کوئی بڑا، لیکن خلقت کے اعتبار سے یہ سب برابر ہی ہیں۔ اسی طرح جب آپ ریاست کا نظم بناتے ہیں، کوئی ادارہ قائم کرتے ہیں، اس میں کچھ لوگوں کو ذمہ داریاں دیتے ہیں تو ان کے لحاظ سے مراتب کا فرق پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں بعض اوقات آپ کو ایسے قاعدے قوانین بھی بنانے پڑتے ہیں، جو اس فرق کا لحاظ کر کے بنائے گئے ہوں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جس شخص کو ہم نے سربراہ مملکت بنا دیا ہے، وہ خلقت کے لحاظ سے کوئی بڑی چیز بن گیا ہے یا کوئی مختلف چیز بن گیا ہے۔ یہ مراتب کا فرق ہے جس کو بعض لوگ اس دائرے میں نہیں رکھتے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کو رکھا ہے۔ وہ اسے بہت آگے بڑھا کر وہ صورتیں پیدا کر دیتے ہیں جن کی طرف سوال میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات کہیں بھی موجود نہیں کہ عورت گاڑی نہیں چلا سکتی یا اس کو اگر باہر شاپنگ کے لیے جانا ہے تو اسے کسی کو ساتھ لے جانے والے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اصل میں یہ مسئلہ اس وجہ سے پیدا ہوا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ کہا کہ اگر دو تین دن کے سفر پر کوئی خاتون نکلتی ہے تو اپنے کسی محرم عزیز کو ساتھ لے لے تاکہ اس پر کوئی تہمت نہ لگ جائے، کوئی فتنہ نہ پیدا ہو جائے۔ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے یہ بڑی عمدہ ہدایت

ہے۔آپ اس زمانے کے سفر کا اندازہ کیجیے۔اونٹ گھوڑے پر سفر کرنا، قافلوں میں جانا، سراؤں اور پڑاؤ میں رہنا۔ اس سارے پس منظر میں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کو دیکھیں تو اس کی معنویت بالکل ٹھیک واضح ہو جاتی ہے۔لیکن آج کے دور میں معاملہ بہت مختلف ہو گیا ہے۔مواصلات کے ذرائع میں بہت ترقی ہو چکی ہے۔آپ چند منٹ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑے اطمینان کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں۔یعنی دس کلومیٹر کا سفر پہلے جو مسائل پیدا کرتا تھا وہ اب ہزاروں میل کا سفر بھی پیدا نہیں کرتا۔اتنی بڑی تبدیلی آ گئی۔اس تبدیلی کو ملحوظ نہ رکھنے سے اس طرح کے مسائل پیدا ہوں گے۔اس طرح سے ایک کے بعد دوسرا مسئلہ آپ نکالتے چلے جاتے ہیں اور نتیجے کے طور پر دین کو ایک ایسی چیز بنا دیتے ہیں کہ جس سے بعض اوقات اہل عقل محسوس کرتے ہیں کہ صورت حال مضحکہ خیز سی ہو گئی ہے۔دین اور فقہ کے احکام، دونوں کو الگ الگ سمجھنا چاہیے، اللہ اور اللہ کے پیغمبر کے احکام اور چیز ہیں، جب کہ ان کی بنیاد پر بننے والی فقہ ایک بالکل اور چیز ہے۔فقہ ایک انسانی چیز ہے اور اس پر ہر دور میں نظر ثانی ہوتی رہنی چاہیے۔

خواتین کی تعلیم

سوال: کیا اسلام نے خواتین کو تعلیم حاصل کرنے سے روکا ہے؟

جواب: اسلام نے خواتین کو اس طرح کی کسی چیز سے نہیں روکا۔اسلام تو کہتا ہے کہ علم حاصل کرنا تم میں سے ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔یعنی دین کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ایک ذمہ داری بنا دی گئی۔پھر اس کے بعد دنیوی اور طبعی علوم ہیں، یہ ہماری روزمرہ کی ضرورت ہیں۔ان کے حصول کے بغیر آپ دنیا میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔قرآن مجید نے اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے کہا کہ 'أعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل' (الانفال ۸:۶۰) یعنی اپنی طاقت منظّم کر کے رکھو اور گھوڑے تیار کر کے رکھو۔اور یہ سب کچھ اسی وقت ہو گا جب آپ علوم و فنون سے دل چسپی رکھتے ہوں گے۔مسلمانوں نے تو ہمیشہ تعلیم کی ترغیب دی ہے۔تعلیمی ادارے قائم کیے، تعلیم کی روایت قائم کی۔اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے لحاظ سے ہوا۔قرآن مجید میں علم، عقل، تدبر اور تفکر پر بہت زور دیا گیا ہے۔لوگ جہاد کا ذکر کرتے ہیں۔دور جدید میں جہاد اب افرادی قوت سے نہیں بلکہ علم سے ہوتا ہے۔ٹیکنالوجی نے غیر معمولی ترقی کر لی ہے۔آپ اپنی قوم کے لیے اس کا دروازہ بند کر لیں گے تو آپ دنیا میں اپنے آپ کو باقی نہیں رکھ سکیں گے۔

اسلام میں پردے کے احکام

سوال: اسلام میں پردے کے اصل احکام کیا ہیں؟

جواب: میں پردے کے بجائے آداب کا لفظ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں یعنی اختلاطِ مردوزن کے کچھ آداب ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے بتائے ہیں۔ پردے کا لفظ نہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے اور نہ ہی حدیث میں، البتہ یہ ازواجِ مطہرات کے بارے میں ضرور استعمال ہوا ہے اور ان کے لیے اس کے بالکل الگ احکام ہیں جو سورۂ احزاب میں بیان ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کے لیے جو صورت حال پیدا کر دی گئی تھی، اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ خصوصی احکام دیے۔ انھی احکام کو بالعموم لوگ دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن قرآن نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ ان احکام کا عام مسلمان عورتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عام مسلمان عورتوں کے لیے جو احکام دیے گئے ہیں، وہ سورۂ نور میں بڑی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یہاں چار باتیں بیان کی گئی ہیں: پہلی بات، مردوں اور عورتوں، دونوں کو الگ الگ خطاب کر کے یہ کہی گئی ہے کہ اپنی نگاہوں پر پہرا بٹھاؤ۔ عام حالات میں تو ہم جب کوئی حکم دیتے ہیں تو بس مذکر کے صیغے استعمال کر دیتے ہیں، وہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہوتا ہے، لیکن قرآن مجید نے وہاں اہتمام کیا اور یہ کہا کہ 'قل للمومنین'، 'قل للمومنات'، اے پیغمبر آپ مسلمان مردوں سے یہ کہہ دیں، اے پیغمبر، آپ مسلمان عورتوں سے یہ کہہ دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو۔ یعنی ان کے اندر ایک دوسرے کے لیے کوئی میلان پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ لباس کا تمھیں خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اعضا کو نمایاں کرنے والا نہ ہو۔ تیسری بات یہ کہی ہے کہ عورتوں کو اپنے سینے کو بھی اچھی طرح ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ چوتھی اور آخری بات بھی عورتوں ہی سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ عورتیں زیب و زینت کرتی ہیں، زیورات پہنتی ہیں، اگر وہ یہ پہنے ہوئے ہوں تو پھر ان کو چھپا کر رکھیں۔ صرف ہاتھ پاؤں اور چہرے کی زیبایش اس سے مستثنیٰ ہے۔ یہ بہت ہی قابل عمل اور بڑے ہی سادہ احکام ہیں۔ اگر آپ ان پر غور کریں تو انھیں ایک شرافت (Decency) ہے، جو پیدا کرنا مقصود ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں میں بھی اسی کو بیان کیا ہے۔ اس سے زائد کوئی بات حدیث کے پورے ذخیرے میں نہیں ملتی۔

خودکشی، ایک حرام فعل

سوال: آج کل مہنگائی عروج پر ہے۔لوگ فقر و فاقے کی وجہ سے اپنے بچوں کے ساتھ خودکشی کر رہے ہیں۔کیا اس اقدام کی اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی ہے اور اس اقدام کا اصل قصوروار کون ہے؟

جواب: اس ضمن میں ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہر وہ چیز جو غلط ہے، وہ ہمیشہ غلط رہے گی۔ جھوٹ ، بددیانتی، رشوت غلط ہے اور ہمیشہ غلط رہے گی۔یہی معاملہ خودکشی کا ہے۔ یہ ایک گناہ کا کام ہے اور ہمیشہ گناہ ہی رہے گا۔ یہ ایک بالکل دوسری بات ہے کہ آپ نے کسی مجبوری کی وجہ سے کسی غلط کام کا ارتکاب کیا ہے۔ مجبوری کا ایک اصول قرآن مجید میں بیان ہو گیا ہے کہ اللہ چاہے گا تو اس کی رعایت دے دے گا۔جس طرح حرام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ 'فمن اضطر غیر باغ و لا عاد'(انعام ۶: ۱۴۵) اگر کوئی آدمی مجبور یا مضطر ہو گیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کا مواخذہ اٹھا دیتے ہیں، اس کا حساب کتاب نرم ہو جاتا ہے۔ یہی چیز اس معاملے میں بھی ہو گی۔

جب کوئی چیز حرام قرار دی جاتی ہے تو اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو امتحان کے لیے بھیجا ہے۔ جب ایک آدمی خودکشی کرتا ہے تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری موت کے بارے میں جو فیصلہ کر رکھا ہے کہ فلاں وقت میں آنی چاہیے، وہ فیصلہ غلط ہے، میں اس کو نہیں مانتا۔ وہ اس کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے یہ ایک بڑا جرم ہے۔ اگر اس طرح کا کوئی اقدام واقعی کسی مجبوری کی حالت میں کیا گیا ہے تو قرآن نے بڑے سے بڑے جرم کے بارے میں بھی یہ اصول بیان کر دیا ہے کہ مجبوری کی رعایت ملے گی۔

آل کے لفظی معنی

سوال: عربی زبان میں 'آل' کے لفظی معنی کیا ہیں؟

جواب: آل کا لفظ آدمی کی اولاد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جسے ہم خاندان کہتے ہیں اور بالکل اسی طریقے سے یہ اس کے پیروکاروں کے لیے اور اس کے پیچھے چلنے والوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اب سیاق و سباق سے یہ فیصلہ ہو گا کہ یہاں یہ کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دنیا بھر میں جتنے الفاظ بھی ہیں، لغت میں لکھے ہوتے ہیں۔ ان کے ایک، دو، تین، چار معنی ہوتے ہیں۔ اس کا سیاق و سباق ہی یہ متعین کرتا ہے کہ یہ یہاں کس مفہوم میں ہے۔

نسل کا انتساب مرد کی طرف یا عورت کی طرف

سوال: نسلِ عام طور سے مردوں سے منسوب ہوتی ہے یا چلتی ہے، کیا یہ اسلامی رویہ ہے؟

جواب: یہ کوئی اسلامی رویہ نہیں ہے۔ اس کی واضح مثال سیدنا مسیح علیہ السلام ہیں۔ وہ بن باپ کے پیدا کیے گئے اور مسیح ابن مریم ہو گئے۔ ان کی اگر آگے شادی ہوتی تو کیا ان کی نسل نہ چلتی؟ یہ تو ایک عام روایت ہے۔ اسلام نے اس معاملے میں کوئی قاعدہ ضابطہ بنا کے لوگوں کو پابند نہیں کیا۔ یہ مغرب کی روایت تھی کہ جس میں عورت کی آزادانہ شخصیت تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ یہ بیگم فلاں اور مسز فلاں کا اسلوب اصل میں مغرب کا دیا ہوا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے بارے میں یا صحابیات کے بارے میں یہ تعبیر اختیار نہیں کی گئی۔ سیدہ اسماء سیدہ اسماء ہی ہیں۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ اس میں باپ کا نام لیا جاتا تھا، لیکن پھر ہمیشہ باپ ہی کا نام لیا جاتا تھا اور وہ بیٹے کے بارے میں بھی لیا جاتا تھا اور بیٹی کے بارے میں بھی لیا جاتا تھا۔

دنیا: ایک دارالامتحان

سوال: دنیا دکھوں کا گھر ہے، اللہ نے دنیا کیوں بنائی ہے؟

جواب: اللہ نے دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے۔ یہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح کر دیا ہے کہ 'خلق الموت والحیوة لیبلوکم ایکم احسن عملاً' (الملک ۶۷: ۲) یہ جو موت و حیات کا کارخانہ ہے، جس پر یہ دنیا قائم ہے، یہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھیں کہ کون اچھا عمل کرتا ہے۔ دیکھا جائے کہ وہ اس میں خیر کا راستہ اختیار کرتے ہیں یا شر کا۔ یوں اس میں لوگوں کو اختیارات بھی دینا پڑے گا۔ جب اختیارات دیے جائیں گے تو ان کا غلط استعمال بھی ہوگا۔ جب اختیارات کا غلط استعمال ہوتا ہے تو اس سے دکھ، ظلم، رنج وغیرہ، یہ سب وجود میں آجاتے ہیں۔

خوب صورتی اور بدصورتی کے معنی

سوال: ہم نے حدیث میں یہ پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب صورتی کو پسند فرماتے ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو

بدصورت ہیں ان کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے؟

جواب: اس حدیث میں خوب صورتی اور بدصورتی کے وہ معنی نہیں ہیں، جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس حدیث میں پوچھنے والے نے یہ نہیں پوچھا کہ سیاہ رنگ یا سفید رنگ میں فرق کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے پوچھا ہے کہ مجھے اچھا جوتا پسند ہے، مجھے اچھا لباس پسند ہے، کہیں اس سے تکبر تو نہیں ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ 'ان اللّٰہ جمیل ویحب الجمال' (مسلم: حدیث نمبر ۹۱)۔ اللہ خوب صورت ہیں، خوب صورتی کو پسند کرتے ہیں۔ تکبر یہ نہیں ہے کہ تم اچھا جوتا پہنو یا اچھا لباس پہنو۔ اور پھر تکبر کی تعریف کی کہ تکبر یہ ہے کہ 'بطر الحق وغمط الناس' (مسلم: حدیث نمبر ۹۱)۔ آدمی کسی حق کے مقابلے میں اکڑ کر کھڑا ہو جائے، سرکشی اختیار کر لے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ ہمارے خوب صورتی اور بدصورتی کے پیمانے بالکل اور ہیں۔ خوب صورتی انسان کے چہرے میں بھی ہوتی ہے اور اس کی گفتگو میں بھی ہوتی ہے۔ دراصل ہم کسی ایک جگہ کے اوپر خوب صورتی کو منطبق کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اصولی بات اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی ہے کہ اگر آپ گورے ہوں یا کالے لیکن صاف ستھرے رہتے ہیں، بن سنور کے رہتے ہیں، آپ اچھا لباس پہنتے ہیں، اپنے گھر در کی سجاوٹ کرتے ہیں تو اللہ اسے پسند کرتے ہیں۔

بینک کی ملازمت

سوال: کیا موجودہ دور میں بینک کی ملازمت کرنا جائز ہے؟

جواب: اس وقت ہمارا بینکاری کا نظام سود پر مبنی ہے۔ اس کی بتدریج اصلاح کرنی چاہیے لیکن اس میں بڑی قباحتیں ہیں۔ اس وجہ سے اگر آپ کوئی بہتر نوکری کر سکتے ہیں تو ضرور کریں۔ لیکن اس کو حرام نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ ہم اس نظام کی اصلاح بھی کرنا چاہتے ہیں، ہماری عدالت میں بھی یہ معاملہ زیر بحث ہے، اس کی اصلاح کے لیے بہت سے اقدامات کرنے پیش نظر بھی ہیں اور لوگ کر بھی رہے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اب یہ اس نوعیت کا کام نہیں ہے جس کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعی حرمت کے ذیل میں رکھا تھا۔

قرآن خوانی اور قل وغیرہ

سوال: کیا قل، دسواں، چالیسواں اور ختم وغیرہ اسلام میں جائز ہیں۔ نیز مرنے والے کے لیے جو قرآن خوانی کرائی جاتی ہے اس سے اس کو کوئی ثواب پہنچتا ہے؟

جواب: آپ جب بھی دین کے معاملے میں کوئی کام کریں تو ایک سوال اپنے آپ سے ضرور کر لینا چاہیے، وہ یہ کہ کیا یہ کام رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے یا آپ نے لوگوں کو کرنے کے لیے کہا ہے؟ اگر ایسا کوئی کام دین کی حیثیت سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو پھر وہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے دین میں نئی نئی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جن کو بدعت کہتے ہیں۔ اس کے لیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر تنبیہ کی کہ میں نے دین کو واضح طور پر تم تک پہنچا دیا ہے۔ اب اس میں کوئی نئی چیز پیدا کرنے کی کوشش نہ کرو۔ دین کے معاملے میں بہت محتاط رہنا چاہیے، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق (Sanction) کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قل، دسواں، چالیسواں یا جو ختم کی محفلیں کی جاتی ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع (شریعت کا حصہ بنانا) کیا ہو۔ ہمارے دین میں مرنے والے کے لیے جو آداب قائم کیے گئے ہیں وہ وہی ہیں کہ آپ تجہیز و تکفین کرتے ہیں، دفن کرتے ہیں، جنازہ پڑھتے ہیں۔ یہ چیزیں ہیں جو دین میں مشروع کی گئی ہیں۔ باقی سب لوگوں کی ایجاد ہیں۔

جہاں تک مرنے والے کو ثواب پہنچانے کا تعلق ہے تو اس بارے میں قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ انسان کو وہی ملے گا، جس کی اس نے جدوجہد کی ہے۔ **لیس الانسان الا ما سعی** (النجم ۵۳: ۳۹) البتہ، آپ دعا کر سکتے ہیں، دعا اللہ کے حضور میں درخواست ہے، وہ چاہیں گے قبول کر لیں گے، چاہیں گے قبول نہیں کریں گے۔

'علم آدم الأسماء' کی تشریح

سوال: سورۂ بقرہ میں ہے کہ 'علم آدم الأسماء' (البقرہ ۲: ۳۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو کچھ نام سکھائے، یہ کیا نام تھے۔ کیا یہ کوئی علم تھا؟

جواب: یہ آیت جس پس منظر میں آئی وہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین پر ایک ایسی مخلوق

بنانے والا ہوں جس کو میں اختیار بھی دوں گا اور اقتدار بھی۔ اس پر فرشتوں نے سوال کیا کہ جب آپ اختیار اور اقتدار دیں گے تو بڑا فساد پیدا ہو جائے گا۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کا خون بہائیں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آدم کی جو آگے اولاد پیدا ہونے والی تھی، اس کو تمثیل کے اسلوب میں لا کر کھڑا کر دیا۔ بالکل ایسے ہی جس طرح سے ہم کسی چیز کو ممثل کر کے سامنے لے آتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت آدم کو بڑے بڑے مصلحین، مجددین، انبیا اور بڑی شخصیتوں کا تعارف کرایا گیا، جو پیدا ہونی تھیں، یہ ان سب کے نام تھے۔ اس کو قرآن نے آگے واضح بھی کر دیا کہ وہ شخصیات پیش کر کے، فرشتوں کے اس سوال کا جواب دیا گیا کہ تمھارا خدشہ اپنی جگہ، لیکن اس سب کچھ کے باوجود ایسے نیک، صالح اور خیر کے علم بردار لوگ بھی پیدا ہوں گے۔

ابلیس جن یا فرشتہ

سوال: ابلیس جنوں میں سے تھا یا فرشتوں میں سے؟

جواب: ابلیس ایک جن تھا۔ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ 'وکان من الجن'۔ (کہف ۱۸: ۵۰) وہ جنوں میں سے تھا۔

سودی نظام اور سیونگ

سوال: میں ایک ریٹائرڈ آدمی ہوں، میری کچھ سیونگ ہے، میں اس کو کہاں انویسٹ کروں؟ پاکستان میں سارا نظام سود پر چل رہا ہے، اور سود کو آپ حرام قرار دیتے ہیں۔ میرے روز مرہ کے کچھ اخراجات بھی ہیں اور Inflation بھی ہے جو کہ آج کل پچیس فی صد ہے۔ اس طرح تو میری رقم دن بدن کم ہوتی جائے گی اور آخر میں بالکل زیرو ہو جائے گی؟ آپ ایسے لوگوں کو کیا مشورہ دیں گے؟

جواب: اب بینکاری نظام میں بھی بہت سی ایسی اسکیمیں نکل آئی ہیں، جو سود سے پاک ہیں۔ اسی طریقے سے جو حکومت کی اسکیمیں ہیں، آپ ان میں بھی انویسٹ کر سکتے ہیں۔ ان میں بھی بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے پر اس طرح سود کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نسبتاً بہتر حل ہے۔

دین کی صحیح تعلیم اور خواتین

سوال: ہمارے ہاں جو مختلف معاملات میں خواتین کے ساتھ فرق روا رکھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں ان پر جو ظلم ہو رہا ہے، اس میں بہتری کے لیے آپ کیا فرمائیں گے؟

جواب: میں یہ سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو اسلام کا صحیح علم دیجیے، ان کو بتائیے کہ یہ رسوم و رواج الگ چیز ہیں اور اسلام بالکل الگ چیز ہے۔ اسلام نام ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کا۔ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، اور یہ بات ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں۔ لوگ اس سے متعلق ایک ایک سوال سامنے رکھیں۔ ہم ان کو یہ بتانے کی پوزیشن میں ہیں کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یا کیا جا رہا ہے، نہ وہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں ہے۔ اسلام کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو سیاست کے لیے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے، رسوم و رواج کی تائید کے لیے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ لوگ گھریلو ظلم اور تشدد کے لیے بھی اس کو استعمال کر لیتے ہیں اگرچہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رشتے قائم کیے ہیں، ان کے فرق کو ہر حال میں قائم رہنا چاہیے۔ ماں، باپ، شوہر کو ایک درجہ برتری رہے گی۔ اس سے رشتے قائم ہوتے ہیں، تہذیب و تمدن قائم ہوتا ہے، گھر بنتا ہے اور خاندان وجود میں آتا ہے۔

محمد عمار خان ناصر

شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ

شخصیت اور فکر و مزاج کے چند نمایاں نقوش

[دیوبند مدرسۂ فکر کے ممتاز عالم دین شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر ۵ مئی ۲۰۰۹ کو قضاے الٰہی سے وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جناب عمار خان ناصر کا تعلق اُنھی کے خانوادے سے ہے زیر نظر تحریر میں عمار صاحب نے مولانا کی شخصیت اور طرز زندگی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔]

میں چار سال کا تھا جب ہم گکھڑ سے گوجرانوالہ منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد گکھڑ جانے کا موقع عام طور پر عید کے دنوں میں یا کسی دوسری خاص مناسبت سے پیدا ہوتا تھا۔ ابتدائی سالوں کی زیادہ باتیں یادداشت میں محفوظ نہیں ہیں، البتہ ایک آدھ واقعہ اب بھی ذہن کی اسکرین پر جھلملاتا ہے۔

دادا محترم، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر کو گھر میں عام طور پر ''ابا جی'' کہہ کر پکارا جاتا تھا اور ہم بچے بھی انھیں اسی نام سے یاد کرتے تھے۔ ابا جی ہر جمعہ کے دن گھر کی چھت پر بیٹھ کر حجام سے سر منڈواتے اور اپنے اور گھر کے بچوں کے ناخن تراشتے تھے۔ انھوں نے اپنے پاس حاضر ہو کر ناخن ترشوانے والے بچوں کے لیے انعام کا بھی اعلان کر رکھا تھا اور مجھے کم سے کم ایک مرتبہ ان سے ناخن ترشوا کر ایک روپے کا بالکل نیا نوٹ انعام میں لینا یاد ہے۔ اسی عمر میں ابا جی سے زندگی کا پہلا اور آخری تھپڑ کھانا بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ ابا جی کے کمرے کی کھڑکی جس گلی کی طرف کھلتی ہے، اس کے آگے ایک خاصا وسیع خالی پلاٹ ہے جو محلے کے بچوں کے لیے کھیل کے میدان کا کام دیتا ہے۔ پلاٹ کی دوسری طرف شیشم کے گھنے درخت کے نیچے ایک قبر تھی جہاں ''رحما ماچھی'' نام کا ایک ملنگ صبح صبح آ کر جھاڑو دیا کرتا اور اللہ ہو، اللہ ہو کے نعرے بلند کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے پاس جن ہیں،

چنانچہ ہم بچے تجسس سے اس کے مخصوص وقت پر گلی میں جا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کی آوازیں سنا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ شرارتی بچوں نے ذرا قریب جا کر اس کو چھیڑا اور شاید کچھ بدتمیزی کی جس پر وہ ناراض ہو کر بچوں کے پیچھے ہولیا۔ باقی بچے تو بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے، لیکن میں گھر میں داخل ہو کر اباجی کے کمرے میں چلا گیا تا کہ کھڑکی سے دیکھ سکوں کہ رحما ماچھی کیا کرتا ہے۔ وہ سیدھا اباجی کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آیا اور آ کر اباجی کو شکایت کی کہ ان بچوں نے مجھے گالیاں دی ہیں۔ اباجی کو اس پر غصہ آیا اور چونکہ اس سے ذرا پہلے میں ہی بھاگتا ہوا آ کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا، اس لیے انھوں نے مجھے شریک جرم سمجھتے ہوئے ایک خاصا وزنی تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔

جب وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوتے تو بچے اور نوجوان مختلف اوقات میں ان کے پاس جا کر ان کا جسم اور ٹانگیں دبانے کو سعادت سمجھتے تھے۔ ان کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا اور وہ عام طور پر بچوں سے مزاح کے انداز میں کہتے تھے کہ ذرا زور لگا کر دباؤ۔ چچا زاد اور پھوپھی زاد بہن بھائی ان کے پاس اکٹھے جاتے تو وہ عام طور پر دل لگی کرتے ہوئے یہ ضرور پوچھتے تھے کہ تم میں سے 'لالہ' (بڑا بھائی) کون ہے؟ اگر لڑکا اور لڑکی ہوتے تو پوچھتے کہ تم 'لالہ' ہو یا یہ 'دِدے' (بڑی بہن) ہے؟

ان کے دبدبے اور احترام کی کیفیت بھی بچپن سے ہی ذہن پر نقش ہے۔ والدہ بتاتی ہیں کہ گکھڑ میں جب وہ دوپہر کے وقت آرام کر رہے ہوتے تھے تو گھر کی خواتین ساری دوپہر باہر صحن سے پرندوں کو اڑانے میں مصروف رہتی تھیں کہ کہیں ان کی آوازوں سے اباجی کی نیند خراب نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب ہم بچے کھیلتے ہوئے کسی وقت دوسری منزل پر اباجی کے کمرے کے اوپر بنے ہوئے کمرے میں چلے جاتے تو دادی محترمہ یا گھر کا کوئی نہ کوئی فرد فوراً پیچھے پہنچ جاتا کہ چھت پر اچھلنے کودنے کی آوازیں نیچے اباجی کے آرام میں خلل پیدا نہ کریں۔ گھر کے افراد کبھی ان کے سامنے ننگے سر نہیں جاتے تھے، بلکہ والدہ بیان کرتی ہیں کہ ایک دن والد گرامی عشا کے بعد سونے کے کپڑوں میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ اتنے میں سرہانے رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ والد گرامی نے فون اٹھایا اور السلام علیکم کہتے ہی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے اور بے اختیار پاس رکھی ہوئی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ پتہ چلا کہ اباجی کا فون تھا۔ خاندان کے بزرگ بتاتے ہیں کہ ڈاڑھی کے معاملے میں وہ اپنی اولاد پر سخت نظر رکھتے تھے اور انھوں نے تنکے کے ساتھ ہر فرد کی ڈاڑھی کی باقاعدہ پیمایش اپنے پاس رکھی ہوئی تھی جس کی مدد سے وہ وقتاً فوقتاً یہ چیک کرتے رہتے تھے کہ کسی نے ڈاڑھی چھوٹی تو نہیں کی۔ تیسری پشت کے نوجوانوں کے ساتھ ان کا رویہ سخت گیر نہیں رہا، لیکن ڈاڑھی کترنے والے نوجوان، ان سے چھپتے پھرتے تھے یا ان کے سامنے جاتے ہوئے ٹھوڑی کو اچھی طرح لپیٹ کر جانے

کا اہتمام کرتے تھے۔

ابا جی کی مہمان نوازی ضرب المثل تھی۔ باہر کے مہمانوں کا کیا ذکر، بچپن میں ہم بچوں میں سے بھی اگر کوئی جاتا اور ان کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوتا تو وہ تاکید سے پوچھتے کہ کچھ کھایا پیا ہے؟ نہیں تو گھر والوں کو بلا کر انھیں مہمانی اور تواضع کا حکم دیتے۔ عام طور پر رخصت ہوتے وقت پچاس یا سو روپے کا تبرک ضرور دیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ ٹھہرنے کا موقع نہ ہوتا تو مشروب کے لیے الگ پیسے دیتے اور کہتے، یہ تمھاری بوتل کے پیسے ہیں۔ اس ضمن میں اکرام نفس کا اتنا خیال ہوتا تھا کہ ایک دفعہ رخصت ہوتے وقت انھوں نے مجھے صرف دس روپے دیے تو ساتھ یہ وضاحت کی کہ ان دنوں مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے خرچہ بہت ہوا ہے، اس لیے صرف دس روپے دے رہا ہوں، بلکہ عم مکرم مولانا عزیز الرحمٰن خان شاہد کا روایت کردہ ایک واقعہ، جو بظاہر ایک لطیفہ لگتا ہے، ابا جی کے محسوسات کی نہایت درست عکاسی کرتا ہے۔ ابا جی کے گھر میں مہمان داری کا سلسلہ بہت زیادہ تھا اور مہمان نوازی کے لیے عام طور پر دوکان سے ٹھنڈے مشروب لائے جاتے تھے۔ ذمہ داری چونکہ کسی ایک فرد کی نہیں تھی، اس لیے بعض اوقات دکان دار کے ساتھ حساب کتاب میں کچھ الجھن پیش آ جاتی تھی۔ پھر بعض اوقات بازار جانے کے لیے کوئی فرد بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ جب ڈبے کے جوس نئے نئے متعارف ہوئے تو کسی نے ابا جی کو یہ مشورہ دیا کہ مہمانوں کے لیے جوس کے ڈبے اکٹھے منگوا کر رکھ لیے جائیں تاکہ آسانی رہے۔ ابا جی کو تجویز اچھی لگی اور ایسا ہی کیا گیا، لیکن پھر انھیں خیال ہوا کہ کہیں مہمان یہ نہ سمجھیں کہ ہمیں ہلکے معیار اور کم قیمت کا مشروب پلایا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب مہمان آتے اور انھیں مشروب پیش کیا جاتا تو ابا جی ان کے سامنے باقاعدہ وضاحت کرتے کہ آپ مشروب لیجیے، اس کی قیمت بھی اتنی ہی ہے جتنی بوتل کی۔

ابا جی کو اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کی تعلیم و تعلم کے سلسلے سے بھی بے حد دلچسپی رہتی تھی اور وہ اس کی پوری پوری خبر رکھا کرتے تھے۔ اس ضمن میں کسی بھی اہم پیش رفت پر ان کی خوشی اور جذبہ تشکر دیدنی ہوتا تھا۔ فروری ۱۹۸۵ء میں میرا حفظ قرآن مکمل ہوا تو جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ابا جی کے علاوہ مولانا عبید اللہ انور اور مولانا محمد اجمل خان رحمہما اللہ بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ ابا جی نے اس موقع پر تفصیلی تقریر فرمائی اور اپنی اولاد میں حفظ قرآن کا سلسلہ آگے بڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑے تھے۔ اسی طرح طالب علمی کے ابتدائی زمانے میں، میں ایک دفعہ ان کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ آپ کے پاس ابن الندیم کی

’الفہرست‘ ہے؟ کیونکہ مجھے اس سے ایک حوالہ دیکھنا ہے۔ یہ حوالہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کے کسی نسخے سے متعلق تھا جس کے بارے میں ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ اس میں معوذتین بھی موجود تھیں۔ ابا جی نے کہا کہ کتاب تو میرے پاس ہے، لیکن کیا تم حوالہ تلاش کر لو گے؟ میں نے کہا کہ جی ہاں۔ اس پر انھوں نے کتاب نکال کر مجھے دی۔ میں نے فہرست دیکھ کر صفحات الٹے پلٹے اور مطلوبہ حوالہ نکال کر ان کو دکھایا جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔

ابا جی سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع غالباً ۱۹۸۸ء میں ملا جب میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں دورۂ تفسیر میں شریک ہوا۔ اس کے بعد ۹۱ء سے ۹۴ء تک درس نظامی کے آخری تین سالوں کی تعلیم میں نے نصرۃ العلوم ہی میں مکمل کی اور ابا جی نے تفسیر قرآن کے علاوہ دورۂ حدیث کے سال صحیح بخاری اور جامع ترمذی کا ایک ایک حصہ پڑھا۔

ان کے سامنے بخاری شریف کی عبارت پڑھنے کی ذمہ داری میری تھی۔ عبارت پہلے سے اچھی طرح تیار کر کے لانا پڑتی تھی۔ ایک آدھ دفعہ ایسا ہوا کہ جتنی عبارت کا مطالعہ کیا گیا تھا، اس سے زیادہ پڑھنا پڑی اور بحمداللہ کوئی غلطی بھی نہیں ہوئی، لیکن ان کی تیز نگاہ فوراً بھانپ گئی اور سبق کے بعد انھوں نے کہا کہ عبارت زیادہ دیکھ کر آیا کرو۔ ایک دفعہ دوران سبق میں فرمایا کہ عبارت پڑھنے والے میں تین خوبیاں ہونی چاہییں: ایک یہ کہ صحیح پڑھے، دوسری یہ کہ تیز پڑھے اور تیسری یہ کہ بلند آواز سے پڑھے۔ یہ صحیح بھی پڑھتا ہے، تیز بھی پڑھتا ہے لیکن اس کی آواز اونچی نہیں ہے۔ ایک دن غالباً میرا گلا خراب تھا۔ سبق سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے فرمایا کہ میرے ساتھ گکھڑ چلو۔ گھر پہنچ کر انھوں نے اپنی الماری سے شہتوت کے شربت کی ایک بوتل نکال کر مجھے دی اور کہا کہ اسے استعمال کرو تاکہ گلا جلدی ٹھیک ہو جائے۔

صحیح بخاری کے سبق میں وہ وقتاً فوقتاً اس بات کا امتحان لیتے رہتے تھے کہ جو روایت پڑھی جا رہی ہے، وہ اس سے پہلے امام بخاریؒ نے کہاں نقل کی ہے۔ بعض اوقات حوالہ بتانے پر انعام بھی دیا کرتے تھے۔ اہم باتوں سے متعلق حوالے وہ باقاعدہ نوٹ کرا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ اہم مقامات پر مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے حاشیہ بخاری کی طرف بھی متوجہ کیا کرتے تھے اور بعض اوقات اس کی عبارت بھی باقاعدہ پڑھی جاتی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے ایسے مقامات خوب ذہن میں رکھے ہوئے تھے جو تنبہ کے بغیر فوراً پڑھنے پر مزلہ اقدام ثابت ہو سکتے ہیں۔ یاد ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے حاشیے سے ایک عبارت پڑھی اور پڑھتے پڑھتے اچانک رک گئے اور کہا کہ آگے

پڑھو، کیا لکھا ہے؟ آ گے 'قلت او کثرت' کے الفاظ تھے، لیکن میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ محشی اپنی طرف سے کوئی نکتہ بیان کرنا چاہتا ہے، فوراً 'قلت' (بصیغہ مونث غائب ازقل یقل) کو 'قلت' (بصیغہ متکلم ازقال یقول) پڑھ دیا۔ ابا جی نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ یہ 'قُلتُ' نہیں، 'قَلَّتْ' ہے۔

دوران سبق میں، کم سے کم دو مواقع یاد ہیں جب انھوں نے بعض ماثور دعاؤں میں عام طور پر پڑھے جانے والے ایسے الفاظ پر تنبیہ کی جو روایات میں ثابت نہیں ہیں۔ ایک مرتبہ اذان کے بعد کی دعا کے بارے میں فرمایا کہ دعاؤں کی عام کتابوں میں 'آت محمدان الوسیلة والفضیلة والدرجة الرفیعة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته وارزقنا شفاعته یوم القیامة' کے جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں، ان میں سے 'والدرجة الرفیعة' اور 'وارزقنا شفاعته یوم القیامة' کے الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں۔ (ابن حجر نے تلخیص الحبیر ۱/۲۱۰ میں 'والدرجة الرفیعة' کے بارے میں اس کی تصریح کی ہے)۔ اسی طرح ایک موقع پر نماز کے بعد پڑھی جانے والی دعا 'اللھم انت السلام ومنك السلام تبارکت یا ذا الجلال والکرام' کا ذکر آیا تو ابا جی نے پوچھا کہ کسی کو یہ دعا یاد ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ ہم اپنے ننھیال (موضع گلیانہ، ضلع گجرات) میں گھر کے قریب جس مسجد میں نماز کے لیے جاتے تھے، وہ بریلوی مکتب فکر کی تھی اور میں نے ہر نماز کے بعد امام صاحب سے سن سن کر یہ دعا جیسے یاد کی ہوئی تھی، اسی طرح پڑھ کر سنا دی: 'اللھم انت السلام ومنك السلام والیك یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام'۔ جیسے ہی میں نے دعا پوری کی، ابا جی نے فوراً کہا: سب ''خرافات'' یاد کی ہوئی ہے۔ پھر بتایا کہ 'والیك یرجع السلام حینا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلام' کے الفاظ حدیث میں نہیں آئے۔ [ملا علی القاری نے 'المصنوع'، رقم ۲۷۴ میں اس کی تصریح کی ہے۔ البتہ ان میں سے 'حینا ربنا بالسلام' کے الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بعد کے ذکر میں تو منقول نہیں، لیکن بعض روایات میں ہے کہ بیت اللہ کی زیارت کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ 'اللھم انت السلام ومنك السلام فحینا ربنا بالسلام' کے کلمات پڑھا کرتے تھے۔ (بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۸۹۹۵، ۸۹۹۸) اسی طرح بزار نے ایک ضعیف روایت میں، جسے ابو حاتم نے منکر قرار دیا ہے (علل ابن ابی حاتم، ۲۰۶۲)، نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج نکلنے کے بعد جو دعا پڑھنے کی تلقین کی، اس میں 'اللھم انت

السلام و منك السلام و اليك يعود السلام‘ کے الفاظ بھی ہیں۔ (مجمع الزوائد ۱۰/۱۱۵)]

مدارس کے طلبہ کے مزاج، نفسیات اور عادات کے بارے میں پرمزاح جملے بھی ان کے سبق کا حصہ ہوتے تھے۔ دوران سبق میں سونے والے طالب علموں کے لیے فرماتے کہ نیند اگر میدان جنگ میں آئے تو وہ سکینہ ہوتی ہے اور اللہ کی طرف سے نازل ہوتی ہے، لیکن اگر سبق کے دوران میں آئے تو شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ امام سبکی کی ’طبقات الشافعیۃ الکبریٰ‘ کے حوالے سے فرماتے کہ اس میں ولی کی بے شمار نشانیاں بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک زیادہ کھانا، کھانا بھی ہے۔ پھر طلبہ سے کہتے کہ آپ خوش ہو جائیں کہ کم از کم ولایت کی یہ نشانی تو آپ میں بھی پائی جاتی ہے۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ میں امتحان لینے کسی جگہ گیا۔ ترجمہ قرآن کے امتحان میں، میں نے سورۂ فاطر کی پہلی آیت: ’الحمد لله فاطر السموات و الارض‘ طالب علم کے سامنے رکھی تو اس نے ترجمہ کیا: ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے فتور مچا رکھا ہے آسمانوں اور زمین میں۔“ عم مکرم مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کی روایت ہے کہ ایک دفعہ رجسٹر پر طلبہ کی حاضری درج کرتے ہوئے ان کے قلم کی سیاہی خشک ہو گئی۔ ایک طالب علم نے اپنا قلم دیا تو جیسے ہی انھوں نے اس کی نوک کاغذ پر رکھی، اس کی سیاہی پھیل گئی۔ اباجی نے مزے سے یہ کہہ کر قلم واپس کر دیا کہ بھئی! یہ لے لو، اسے طالب علموں والی بیماری ہے۔ طلبہ کو کسی بات کی تحقیق کی ترغیب دیتے ہوئے یہ خاص جملہ اکثر دہراتے تھے کہ ”ذوق اور شوق دو بھائی تھے۔ عرصہ ہوا کہ فوت ہو گئے، رحمہما اللہ“۔ یہ بھی فرماتے کہ آپ حضرات ”طلباء“ نہیں بلکہ ”طلبہ“ بنیں، اور پھر وضاحت کرتے کہ ”طلباء“ اسم فاعل کا، جبکہ ”طلبہ“ صفت مشبہہ کا صیغہ ہے جس میں دوام اور استمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دوران سبق میں سینما کا ذکر آیا تو فرمایا کہ میں نے آج تک زندگی میں کبھی سینما نہیں دیکھا، البتہ ”آپ جیسے ثقہ بزرگوں“ سے سنا ہے کہ اس میں یہ اور یہ ہوتا ہے۔

بعض دفعہ دلچسپ علمی لطائف بھی سناتے تھے۔ ’و لا الضالین‘ میں ضاد کے تلفظ پر یہ لطیفہ سناتے کہ گکھڑ میں ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ اس کا صحیح تلفظ ’و لا الدالین‘ ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی، یہ بتاؤ کہ آپ جب نماز کے لیے اپنے اعضا دھوتے ہیں تو کیا کہتے ہیں: میں نے ”وضو“ کیا یا میں نے ”ودو“ کیا؟ اس نے کہا کہ ”وضو“ کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدانخواستہ آپ کی اہلیہ کو کوئی خطرناک بیماری لگ جائے تو آپ کیا کہیں گے: میری بیوی کو ایک موذی مرض لگ گیا ہے یا ایک موذی ”مرد“ لگ گیا ہے؟ جب باقی ہر جگہ ضاد ہی بولتے ہو تو لا الضالین میں بھی یونہی پڑھو۔ اسی طرح بتاتے کہ ایک دفعہ سفر کے دوران میں گاڑی میں کوئی شیعہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور سیدنا

علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر گفتگو شروع کر دی۔ دوران گفتگو میں اس نے کہا کہ علی کی تو قرآن میں بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ دلیل کے طور پر اس نے 'انه لعلی حکیم' یا 'وهو العلی العظیم' جیسی کچھ آیات سنائیں۔ ابا جی کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا: قرآن میں تو یزید کا بھی بڑا رتبہ بیان ہوا ہے۔ اس نے کہا، وہ کہاں؟ میں نے کہا، قرآن میں ہے: ویزیدهم من فضله۔ اس نے کہا کہ یہ 'یزید' کے بعد 'هم' ضمیر کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا کہ اس سے مراد بنوامیہ ہیں، یعنی بنوامیہ کا یزید اللہ کے فضل میں سے ہے۔ بتاتے تھے کہ گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ میں درس قرآن کے دوران میں ایک صاحب نے کہا کہ مولانا! یہ ڈاڑھی تو ایک غیر فطری چیز ہے، اسے کیوں ضروری قرار دیا جاتا ہے؟ پوچھا گیا کہ یہ کیسے غیر فطری ہے تو انھوں نے کہا کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کی ڈاڑھی نہیں ہوتی۔ ابا جی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ جب آپ پیدا ہوئے تھے تو آپ کا ایک بھی دانت نہیں تھا، اس لیے آپ اپنے سارے دانت نکلوا دیں۔ پھر پیدایش کے وقت آپ بالکل ننگے تھے، اس لیے اگر فطری یا غیر فطری کا معیار یہی ہے تو اب بھی آپ اپنے کپڑے اتار دیجیے۔

وہ تفسیر میں حضرت مولانا حسین علی رحمہ اللہ کے تلمیذ تھے اور ان کا ذکر ''ہمارے حضرت مرحوم'' کے الفاظ سے کیا کرتے تھے۔ بعض مقامات پر میانوالی کی بولی میں ان کا ترجمہ خاص طور پر سنایا کرتے تھے۔ مثلاً فبهت الذی کفر (البقرہ ۲۵۸) کے تحت ان کا یہ ترجمہ سناتے تھے کہ ''کافر بھڑوی دا پچی تھی گیا'' (نامراد کافر لاجواب ہو گیا)۔ اسی طرح 'قال اخسئوا فیها ولا تکلمون' (المومنون ۱۰۸) کا ترجمہ یہ سناتے کہ ''چپے تھیوو، نہ باں باں کرو۔'' اپنے درس تفسیر میں قرآنی مضامین کے باہمی ربط کو واضح کرنے کا بھی خاص اہتمام کرتے تھے، البتہ ان کے ہاں اس حوالے سے مولانا حسین علی صاحب کے مخصوص تفسیری ذوق کے بجائے عمومی رنگ غالب دکھائی دیتا تھا۔ ربط مضامین کو واضح کرنے کے لیے وہ دوسری تفسیروں کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''سبق الغایات فی نسق الآیات'' اور ''بیان القرآن'' کا حوالہ بکثرت دیا کرتے تھے۔

کمزور اور پر تکلف تاویل پر مبنی تفسیری آرا کی تردید بھی ان کے درس کا خاص حصہ ہوتی تھی۔ مثلاً 'ورفعنا فوقکم الطور' (البقرہ ۶۳) ضمن میں مولانا مودودیؒ کی اس رائے کا ذکر کرتے کہ یہ پہاڑ حقیقتاً اپنی جگہ سے بلند نہیں کیا گیا تھا، بلکہ بنی اسرائیل کو صرف ڈرایا گیا تھا کہ دیکھو، اگر نہیں مانو گے تو یہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائے گا۔ پھر فرماتے کہ اگر یہ مراد ہے تو 'واذ نتقنا الجبل فوقهم کانه ظلة' (الاعراف ۱۷۱) کا کیا مطلب ہے جہاں صاف طور پر پہاڑ کو

اپنی جگہ سے اکھاڑنے اوراسے سائبان کی طرح ان کے سروں پر معلق کر دینے کا ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت: 'فخذ اربعة من الطير فصرهن اليك' (البقرہ۲۶۰) کی تفسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ راے بیان کرتے کہ ابراہیم علیہ السلام کو ان چار پرندوں کو ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، بلکہ یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کریں اوراس کے بعد ان میں سے ہر پرندے کو ایک ایک پہاڑ پر چھوڑ کر انھیں پکاریں تو یہ تیزی سے ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ پھر فرماتے کہ مولانا نے یہاں ٹھوکر کھائی ہے اوران کی یہ تاویل باطل ہے، کیونکہ یہاں سیاق میں زیر بحث سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں، جبکہ مولانا کی تاویل کی صورت میں اس واقعے کا احیاے موتیٰ کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔

قرآن مجید کے مختلف نصوص سے گمراہ فرقوں کے استدلالات کا جواب بھی وہ اہتمام سے ذکر کرتے تھے۔ مثال کے طور پر 'جاهد الكفار والمنافقين' (التوبہ۷۳) کے تحت اہل تشیع کے اس استدلال کی تردید کرتے ہوئے کہ 'والمنافقين' میں واؤمع کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے نبی، آپ ان منافقین (یعنی نعوذ باللہ صحابہ) کے ساتھ مل کر کفار کے ساتھ جہاد کریں، وہ صاحب 'متن متین' علامہ عبدالرسول اور کافیہ کے شارح رضی استراباذی کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ یہ دونوں صراحت کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں نصاً وصراحتاً مفعول معہ کی کوئی مثال موجود نہیں۔ فرماتے تھے کہ یہ دونوں غالی شیعہ ہیں، لیکن نحو کے امام ہیں۔ متن متین کا حوالہ وہ 'وارجلكم الى الكعبين' (المائدہ۶) کے تحت پاؤں پر مسح کرنے کے شیعی موقف کے جواب میں بھی دیا کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جر جوار کا اسلوب کہیں نہیں پایا جاتا۔ متن متین شاید ان کی پسندیدہ کتاب تھی۔ فرماتے تھے کہ یہ نحو کی ادق ترین کتاب ہے۔ (یہ کافیہ کی طرز پر چھوٹے چھوٹے اور مغلق جملوں میں تصنیف کردہ کتاب ہے اورکسی دور میں تکمیل فنون کے اسباق میں پڑھائی جاتی رہی ہے۔ بالعموم دست یاب نہیں، البتہ اباجی کے پاس ایک موقع پر اس کا نسخہ دیکھنا مجھے یاد ہے۔) اسی طرح 'ليذهب عنكم الرجس اهل البيت' (الاحزاب۳۳) کے ضمن میں اہل تشیع کا یہ استدلال بیان کرتے کہ یہاں جمع مذکر کی ضمیر استعمال ہوئی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اہل بیت میں ازواج مطہرات شامل نہیں ہیں۔ پھر بتاتے کہ عربیت کے لحاظ سے جمع مذکر کی ضمیر واحد مونث کے لیے بھی استعمال ہوسکتی ہے۔ اس پر قرآن مجید کی آیت: 'رحمت الله وبركته عليكم اهل البيت' (ہود۷۳) کے علاوہ 'وان شئت حرمت النساء سواكم' اور 'فلا تحسبي انى تخشعت بعدكم' جیسے اشعار بطور نظیر پیش کرتے۔

بے انتہا وسعت مطالعہ کے باوجود علمی نکات کی تحقیق اور معلومات میں اضافے کے ضمن میں وہ 'حیث وجدها فهو احق بها' کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ عم مکرم مولانا عبدالحق خان بشیر نے ۱۹۷۷ء میں گوجرانوالہ جیل میں قید کی یادداشتوں میں بیان کیا ہے کہ جیل میں ان کی بیرک کی صفائی پر ایک پاگل مامور تھا جو اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا، لیکن تاریخ کا وسیع مطالعہ رکھتا تھا اور اس کی یادداشت قائم تھی۔ ابا جی اس سے استفادے کے لیے اس کی پسند کے مطابق سگریٹ اور بسکٹ کے ڈبے منگوا لیتے چائے، بنوا کر اس کے سامنے رکھ دی جاتی، اور وہ تاریخی معلومات اگلنا شروع کر دیتا۔ اس طرح کئی نشستوں میں ابا جی نے اس سے انقلاب فرانس، انقلاب ترکی، جنگ عظیم اول و دوم اور تاریخ کے دوسرے بہت سے اہم مراحل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس سلسلے میں وہ نہایت منصف مزاج بھی تھے اور مسلکی یا دینی اختلاف ان کے لیے کسی کے علم وفضل کا اعتراف کرنے میں مانع نہیں بنتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے بارے میں گفتگو ہوئی تو فرمایا کہ وہ علم حدیث میں کمزور تھے، لیکن باقی علوم کے ماہر تھے۔ ان کے متواضع مزاج کا اظہار علم کے معاملے میں بھی ہوتا تھا اور وہ اپنے خوردوں سے بھی کوئی مفید بات لینے میں حجاب محسوس نہیں کرتے تھے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کے زمانہ طالب علمی میں، ایک مرتبہ مجھے اس نکتے کی تحقیق کی ضرورت پیش آئی کہ اہل نحو جملے کے اعراب میں حرف 'لما' کا کیا محل بیان کرتے ہیں۔ میں نے ابا جی سے دریافت کیا تو غالباً انھوں نے کہا کہ مجھے مستحضر نہیں، تم خود دیکھو۔ میں نے مختلف کتابوں کی مراجعت کی تو 'تاج العروس' میں یہ وضاحت مل گئی کہ 'لما' جملے میں واقع فعل کا ظرف ہوتا ہے، البتہ اس کا عامل کبھی جواب شرط کی صورت میں اس سے موخر ہوتا ہے (جیسے لما ورد ماء مدين وجد عليه امة) اور کبھی اس سے مقدم (جیسے استعد القوم لقتال العدو لما احسوا بهم)۔ اگلے دن ابا جی اپنے اسباق سے فارغ ہوئے تو میں نے یہ بات ان کے سامنے پیش کی۔ وہ کھڑے تھے، فوراً بیٹھ گئے اور جیب سے اپنا قلم اور کاغذ کی ایک چٹ نکال کر کہا کہ ذرا دوبارہ بتاؤ، تاج العروس میں کیا لکھا ہے؟ میں نے بتایا تو انھوں نے اسے باقاعدہ نوٹ کر کے اپنے پاس جیب میں رکھ لیا۔

ابا جی کے روزمرہ معمولات میں دم کرنا اور تعویذ لکھنا بھی شامل تھا۔ دوران سبق میں ایک مرتبہ تعویذات کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ زیر بحث آیا تو انھوں نے مشکوٰۃ المصابیح منگوائی اور اس میں سے عبداللہ بن عمرو بن العاص

رضی اللہ عنہ کی حدیث باقاعدہ پڑھ کر سنائی جس میں ذکر ہے کہ وہ 'اعوذ بکلمات اللہ التامات من غضبہ وعقابہ وشر عبادہ ومن ھمزات الشیاطین وان یحضرون' کے کلمات اپنے بڑے بچوں کو یاد کرا دیتے تھے جبکہ چھوٹے بچوں کے گلے میں لکھ کر لٹکا دیا کرتے تھے۔ (ترمذی، رقم ۳۴۵۱ و مسند احمد، رقم ۶۴۰۹) ایک زمانے میں جب میرے ذہن میں تعویذات کے جواز کے سلسلے میں تردد پیدا ہوا تو میں نے ابا جی نے دریافت کیا تھا کہ اس روایت کی سند میں تو محمد بن اسحاق ہے جس پر آپ نے احسن الکلام میں شدید ترین جرح نقل کی ہے۔ ابا جی نے فرمایا کہ اس کی روایت احکام میں قبول نہیں لیکن تاریخ کے دائرے میں قابل استدلال ہے۔ یاد نہیں کہ میں نے اس پر مزید یہ اشکال پیش کیا تھا یا نہیں کہ اس روایت سے تو ایک شرعی حکم ہی کے ضمن میں استدلال کیا جا رہا ہے، اس لیے اس پر تاریخ کا اصول کیونکر لاگو ہو سکتا ہے؟ بہرحال مجھے بے شمار دفعہ انھیں تعویذ لکھتے ہوئے دیکھنے کا اور ایک آدھ دفعہ ان کے کہنے پر تعویذ کو تہ کرنے کا موقع ملا۔ عام طور پر وہ تعویذ میں ۷۸۶ کے بعد 'رب الناس اذھب الباس' کے کلمات لکھا کرتے تھے، جبکہ دم کرتے ہوئے بالعموم ان کی زبان سے 'بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شیء' کے الفاظ سننے میں آتے تھے۔ گکھڑ میں عصر کے بعد کا وقت عام طور پر اسی مقصد کے لیے حاضر ہونے والے حضرات وخواتین کے لیے مخصوص تھا، لیکن تعویذات کا کاروبار کرنے والے عاملین کے برعکس ان کی ساری کوشش تعویذ پر لوگوں کا یقین بنانے کے لیے نہیں بلکہ اس سے ہٹانے کے لیے ہوتی تھی۔ وہ کم وبیش ہر آنے والے سے کہتے تھے کہ شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے گا تو دم یا تعویذ میں اثر پیدا کر دے گا۔ وہ خود گھٹنوں کے درد میں مبتلا تھے اور کئی دفعہ دم کی تاثیر کے اللہ کی مشیت پر منحصر ہونے کو واضح کرنے کے لیے کہتے تھے کہ میں خود ایک طویل عرصے سے گنٹھیا کا شکار ہوں، اگر میرے پاس کوئی شرطیہ دم ہوتا تو پہلے اپنا علاج نہ کر لیتا؟ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مولوی صاحب ان کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ میرے پاس ایک ایسا دم ہے جس سے بیمار کو یقینی طور پر آرام آ جاتا ہے۔ ابا جی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میرے گھٹنوں میں پرانا درد ہے، آپ ذرا اپنا دم آزمائیں۔ انھوں نے ایک دفعہ دم کیا اور پوچھا کہ کچھ افاقہ ہے؟ ابا جی نے کہا: نہیں۔ انھوں نے دوسری دفعہ دم کیا تو ابا جی نے کہا: کوئی فرق نہیں۔ تیسری دفعہ دم کے بعد زور سے کہا کہ ذرہ برابر بھی آرام نہیں ہے۔ وہ صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہر مسئلے کا حل تعویذ میں تلاش کرنے والوں کے لیے بعض دفعہ وہ دلچسپ تبصرے بھی کیا کرتے تھے۔ بچپن میں ایک دفعہ والدہ نے مجھے ان کے پاس بھیجا کہ اپنے لیے پڑھائی کا تعویذ لے کر آؤ۔ یاد نہیں کہ ابا جی نے تعویذ دیا یا

نہیں، لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''پتر، پڑھائی پڑھن نال ہوندی اے'' (بیٹا، پڑھائی پڑھنے سے ہوتی ہے)۔ ایک صاحب آئے اور انھوں نے اپنے گھٹنوں کے درد کا ذکر کیا۔ ابا جی نے کہا کہ عمر کتنی ہے؟ اگر چالیس سال سے زیادہ ہے تو پھر یہ درد ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی ان کے طنز و مزاح کا خاص طور پر ہدف بنے رہتے تھے اور وہ بعض توہم پرست لوگوں کے دلچسپ واقعات بھی سنایا کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ ایک میجر صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے، اس کے لیے تعویذ دے دیں۔ میں نے کہا کہ میں تعویذ دے دیتا ہوں، لیکن عام طور پر لوگ خواہ مخواہ جادو کے وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ مجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ انھوں نے کہا، میرے پاخانے سے بدبو آتی ہے۔ ابا جی نے کہا کہ اس پر میں نے لاحول ولا قوۃ پڑھی اور کہا کہ بھائی، وہ پاخانہ ہے، کوئی کستوری تو نہیں۔ ایک دفعہ سبق میں فرمایا: ''میں نے آج تک نہ کوئی جن دیکھا ہے اور نہ جنوں کا عامل دیکھا ہے، البتہ ٹھگ بڑے سنے ہیں کہ فلاں ہے اور فلاں ہے۔'' ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی سناتے کہ جھنگ میں کسی شخص نے خودکشی کر لی تو اس کے بہن بھائی باقاعدہ سفر کر کے ان کے پاس گکھڑ آئے اور کہا کہ ہم نے آپ کی ایک تقریر سنی تھی جس میں آپ نے معجزات اور کرامات کا برحق ہونا بیان کیا تھا، اس لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ ''کرامت'' دکھا کر ہمارے مردہ بھائی کو زندہ کر دیں۔

دوران سبق میں کوئی خاتون دم یا تعویذ کے لیے آ جاتی تو انھیں ناگوار گزرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون سبق کے دوران میں آ گئی تو ابا جی نے بادل نخواستہ اسے پاس بلا لیا۔ اس نے اپنی کوئی تکلیف بتائی اور ابا جی نے اس کی بات سن کر اسے تعویذ دے دیا۔ اب وہ پوچھنے لگی کہ میں پرہیز کیا کروں؟ ابا جی نے کہا کہ کوئی پرہیز نہیں، ساری حلال چیزیں کھاؤ۔ اس نے دو تین بار یہی سوال کیا تو ابا جی نے کہا کہ بی بی! میرا دماغ نہ کھاؤ، باقی سب کچھ کھاؤ۔ اسی طرح اسباق سے فارغ ہونے کے بعد صوفی صاحب کے گھر میں خواتین ان کے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھیں۔ جمعرات کو انھیں خاص طور پر واپسی کی جلدی ہوتی تھی، کیونکہ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر جمعرات کو پیٹ کی صفائی کے لیے جلاب لیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی خاتون نے غالباً تعویذ کے لیے اپنی لمبی چوڑی کتھا سنانا شروع کر دی تو ابا جی نے جھلا کر کہا کہ بی بی، مختصر بات کرو، میں نے جا کر جلاب بھی لینا ہے۔ بتاتے تھے کہ ایک دفعہ مجھے اسی طرح جانے کی جلدی تھی کہ نکلتے نکلتے ایک خاتون آ گئی۔ میں نے غصے میں اسے خالی کاغذ تہ کر کے تعویذ کے طور پر دے دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ خوش خوش آئی اور کہنے لگی کہ مولوی صاحب، آپ کے تعویذ کی برکت سے میرا مسئلہ حل ہو گیا

ہے۔

یہاں یہ بات بیان کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ دم اور تعویذ کے لیے آنے والی خواتین کے معاملے میں ان کے طرزعمل سے پتا چلتا تھا کہ وہ چہرے کے پردے کے بارے میں متقدمین احناف کے موقف کے قائل ہیں، کیونکہ انھوں نے کبھی مدرسے میں یا گھر میں آنے والی کسی خاتون کو، خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھی، چہرہ چھپانے کے لیے نہیں کہا۔ کئی مرتبہ ہم گھر کے نوجوان ان کے پاس ہوتے اور ہماری موجودگی میں خواتین دم کے لیے آ جاتیں تو وہ کبھی ہم سے باہر جانے کے لیے نہیں کہتے تھے۔ ان کی اپنی اولاد میں چچازاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد لڑکے لڑکیاں بعض دفعہ ان کے پاس جا کر اکٹھے بیٹھ جاتے تو وہ اس پر بھی کبھی کوئی نکیر نہیں فرماتے تھے۔ اباجی کے گھر میں دیور بھابھی، چچی بھتیجا اور ممانی بھانجا وغیرہ کے مابین پردے کا بھی کوئی تصور نہیں تھا، البتہ بہت بعد میں بعض خواتین نے اپنے ذاتی ذوق سے ایسا کرنا چاہا تو اباجی نے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں فرمایا۔ اباجی کے مذکورہ طرزعمل کے علاوہ 'الا ما ظهر منها' (النور۳۱) کے تحت انھوں نے اس مسئلے کی وضاحت میں جو کچھ فرمایا، اسے بھی یہاں لفظاً نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فرمایا:

> ''اس میں خاصا اختلاف ہے کہ عورتوں کا چہرہ، ان کے ہاتھ اور ان کے قدمین، یہ عورت ہیں یا نہیں۔ پھر یہ کہ فی الصلوٰۃ وفی غیر الصلوٰۃ کوئی فرق ہے یا نہیں۔ تیسرا کہ اجنبی یا غیر اجنبی کا بھی کوئی فرق ہے یا نہیں۔ کبیری میں ہے کہ عورت کا چہرہ، یدین اور قدمین عورت نہیں ہیں، لا فی الصلوة ولا فی غير الصلوة، لا فی حق الاجنبی ولا فی حق غير الاجنبی۔ وعليه الاتفاق۔ فقہاے احناف کا اس پر اتفاق ہے۔ ہاں پردہ کرنا مستحب ہے، واجب نہیں۔ [لیکن] عوام کے سامنے یہ بات بیان نہ کرنا۔''

یقین سے یاد نہیں کہ بات کا پس منظر کیا تھا، لیکن ایک دفعہ دوران سبق میں انھوں نے مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی کے حوالے سے فرمایا کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں، لیکن بعض امور میں تشدد سے کام لیتے ہیں۔

اباجی کی تصنیف وتالیف کا موضوع زیادہ تر اختلافی مسلکی مسائل رہے اور انھوں نے مختلف مباحث کے ضمن میں پچاس کے لگ بھگ تصانیف میں اکابر دیوبند کے نقطۂ نظر کی بھرپور اور مدلل علمی ترجمانی کی خدمت انجام دی۔ مجھے چونکہ ان بحثوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اس لیے زمانہ طالب علمی میں اباجی کی کتابوں سے بھی کچھ زیادہ اعتنا نہیں رہا، بلکہ ایک لطیفے کی بات یہ ہوئی کہ ۸۹ء میں ہم نے ماہنامہ 'الشریعہ' کا آغاز کیا تو اباجی کی تصانیف میں

سے بھی کوئی نہ کوئی انتخاب ہر ماہ شامل کیا جاتا تھا اور چونکہ 'الشریعہ' کے موضوعات اور دائرۂ کار سے مسلکی اختلافات کو خارج رکھنے کی باقاعدہ پالیسی طے کی گئی تھی، اس لیے اباجی کی تصانیف سے انتخاب کرتے ہوئے بھی اس کا لحاظ کیا جاتا تھا کہ تحریر عمومی نوعیت کے کسی موضوع سے متعلق ہو۔ اس ضمن میں ایک موقع پر میں نے تفنن کے انداز میں والد گرامی سے یہ کہا کہ ہم اباجی کی کتابوں میں سے اپنی ترجیحات کے مطابق انتخاب واقتباس آخر کب تک کر سکیں گے؟ والد گرامی نے یہ بات اباجی کے گوش گزار کر دی۔ پھر ایک موقع پر خود میں نے بھی اباجی کے سامنے یہی بات دہرانے کی حماقت کی تو انھوں نے فرمایا کہ میری کتابوں میں اتنا مواد ہے کہ تم ساری زندگی بھی اس میں سے انتخاب کرتے رہو تو مواد ختم نہیں ہوگا۔ ان کی یہ بات درست تھی، البتہ مجھ پر اس کی اہمیت بہت بعد میں اس وقت واضح ہوئی جب اصول فقہ اور اصول حدیث وغیرہ کے ساتھ باقاعدہ علمی اشتغال کا موقع ملا اور میں نے دیکھا کہ اباجی کی تصانیف میں جگہ جگہ بہت سی اہم علمی واصولی بحثوں کا ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے، چنانچہ میں نے ان مباحث کو اس خیال سے نشان زد کرنا شروع کر دیا کہ اگر انھیں مربوط طریقے سے الگ یکجا کر دیا جائے تو اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر اور اصول عقائد سے متعلق مستقل مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعہ ''فن حدیث کے اصول ومبادی'' کے عنوان سے باقاعدہ مرتب بھی ہو چکا ہے اور ان شاء اللہ جلد زیور طبع سے آراستہ ہو جائے گا۔

جہاں تک اباجی کے طرز بحث کا تعلق ہے تو اس کی خصوصیات پر کئی پہلوؤں سے مفصل گفتگو کی جا سکتی ہے، لیکن مجھے اپنے ذوق کے لحاظ سے اس میں دو باتیں بے حد نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ دوسرے فریق کا موقف نہایت دیانت داری سے اور پوری تفصیل کے ساتھ خود اس کے اپنے الفاظ میں نقل کرتے ہیں، بلکہ ان کی بعض تصانیف میں اگر فریق مخالف کی نقل کی جانے والی تحریروں کا تناسب کتاب کی کل ضخامت سے دیکھا جائے تو وہ ایک چوتھائی سے کم نہیں ہوگا۔ دوسری بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بحث کے دوران میں کہیں بھی اصل نکتے کو چھوڑ کر کسی غیر متعلق بات کے درپے ہونے، کسی بحث طلب نکتے کو نظر انداز کرنے، دوسرے فریق پر اس کی غلطی واضح کرنے کے بجائے قارئین کو الفاظ کے ہیر پھیر میں ڈالنے یا اس نوعیت کے دوسرے مناظرانہ ہتھکنڈے اختیار نہیں کرتے۔ غالباً عم مکرم مولانا عبد الحق خان بشیر زید مجدہ ہم کو ایک موقع پر نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کبھی یہ سمجھ کر گفتگو نہ کرو کہ تمھاری بات کو صرف تمھارے موافقین سنیں اور پڑھیں گے، بلکہ یہ ذہن میں رکھو کہ تمھارے مخالفین بھی گفتگو کے مخاطب ہیں اور تمھاری بات سے ان کے اندر اپنے نقطۂ نظر پر نظر ثانی کے لیے آمادگی پیدا ہونی چاہیے۔

یہ اسی جذبے اور داعیے کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے کہیں بھی کسی نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے محض موافقین کی ذہنی

واعتقادی وابستگی کو اپیل کرنے جبکہ مخالف کے علمی استدلالات سے صرف نظر کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ مثال کے طور پر اگر وہ ''صرف ایک اسلام'' میں حدیث کے بارے میں ڈاکٹر برق مرحوم کے نظریات بیان کر کے ان کے سارے اعتراضات اور استدلالات کو یہ کہہ کر جھٹک دیتے کہ ''دیکھو، یہ شخص تو منکر حدیث ہے، اس لیے اس کی کسی بات یا استدلال کی کیا وقعت ہوسکتی ہے!'' یا ''چراغ کی روشنی میں'' مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت اور دیگر کفریہ نظریات درج کر کے فرماتے کہ ''کیا ایسے شخص کی پیش کردہ کوئی بات یا دلیل مذہبی لحاظ سے قابل توجہ ہوسکتی ہے؟'' تو عوام الناس کو گمراہی سے بچانے کی حد تک یہ طریقہ کافی اور موثر ہوتا، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ان دونوں کتابوں میں اور اس کے علاوہ اپنی ہر تصنیف میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ فریق مخالف کے استدلال میں جو جونکتہ بھی علمی طور پر وضاحت کا تقاضا کرتا ہے، اسے زیر بحث لایا جائے اور محض مذہبی قارئین کے ذہنی تعصّبات کو اپیل کرنے کے بجائے، علمی طور پر مخالف نقطہ نظر کی غلطی واضح کی جائے۔

کسی بیہودہ سے بیہودہ بات پر بھی ابا جی کا قلم غصے کے چھینٹے اڑاتا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ تحمل اور سنجیدگی کا خود التزام کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لکھنے والوں کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے۔ ۱۹۹۶ء میں میری اولین تصنیف ''امام اعظم ابوحنیفہ اور عمل بالحدیث'' کے زیر عنوان مدرسہ نصرۃ العلوم کے ادارۂ نشر واشاعت کے زیر اہتمام شائع ہوئی جس میں، میں نے امام ابوحنیفہ کی آرا پر جلیل القدر محدث امام ابن ابی شیبہ کے ایک سو چھبیس اعتراضات کا ایک طالب علمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ ابا جی نے اس پر مجھے تفصیلی خط لکھا اور کتاب میں موجود بہت سی اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے ان الفاظ میں حوصلہ افزائی فرمائی کہ ''اگر اس کتاب کی صحیح معنی میں تصحیح اور خدمت ہو جائے تو ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہوگا''، جبکہ بعد میں زبانی شاباش دیتے ہوئے خاص طور پر اس بات کی تحسین کی کہ کسی بھی بات کا جواب دیتے ہوئے تمھیں غصہ نہیں آیا، ورنہ بعض جگہ غصے کا آ جانا ناگزیر ہے۔

نامعقول باتوں کی نامعقولیت واضح کرنے کے لیے وہ غصے اور جذباتی پن کے اظہار کے بجائے ظرافت کا سہارا لیتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم نے اپنی کتاب ''دو اسلام'' میں مذہبی لباس اور وضع قطع کے بارے میں بعض استہزائیہ جملے لکھے تو ابا جی نے اس کے جواب میں لکھا:

> ''ہم برق صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ آپ ازراہ انصاف یہ فرمائیں کہ بجائے اسلامی صورت اور سیرت کے اگر ایک شخص ڈاڑھی منڈوا کر جیسے چھیلی ہوئی گنڈیری ہوتی ہے، کرزن فیشن کی مونچھیں رکھ کر (جو دور سے ایسے معلوم ہوتی ہیں کہ گویا ناک کے سامنے مکھی بیٹھی ہوئی ہے)، گلے میں سانپ (نکٹائی) لٹکا کر، منہ میں سگریٹ لے

کر، سر پر ہیٹ رکھ کر اور ٹخنوں سے نیچے پتلون لٹکا کر (جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہوا ہوتا ہے اور جس میں پیچھے سے چلتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ چوتڑ باتیں کر رہے ہیں) اور پاکٹ میں مسواک کی جگہ خنزیر کے بالوں کی برش ڈال کر..... حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہو تو کیا آپ ایسے شخص کو مسلمان اور اپنا امتی تصور فرمائیں گے؟'' (صرف ایک اسلام، ص ۲۷، ۲۸)

مزاح اور ظرافت ویسے بھی ان کی طبیعت کا حصہ تھا اور وہ ایسے برجستہ اور فی البدیہہ جملے کہا کرتے تھے کہ دیر تک ان کا لطف باقی رہتا تھا۔ بچپن میں میرے چھوٹے بھائی عزیزم ناصر الدین خان عامر سلمہ کا نام اس کے گول مٹول جسم کی وجہ سے انھوں نے ''ڈڈو'' رکھا ہوا تھا اور وہ عام طور پر پیار سے اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ والد گرامی کے شب وروز کے اسفار کی وجہ سے ابا جی نے ان کے لیے ''دابۃ الارض'' کا لقب تجویز کیا ہوا تھا۔ میری کتاب ''امام ابوحنیفہ اور عمل بالحدیث'' چھپی تو ابا جی نے مجھے پانچ سو روپے بطور انعام دیے اور خط میں لکھا کہ ''تمھاری قیمت تو بہت زیادہ ہے، لیکن میں یتیم ہوں، اس لیے صرف پانچ سو روپے انعام دے رہا ہوں۔'' گکھڑ میں انھیں اپنی مسجد کے لیے حفظ کے استاذ کی ضرورت تھی۔ ابا جی نے کسی سے قاری کی تلاش کے لیے کہا تو ساتھ ہی حلق کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ''یہ دیکھ لینا کہ وہ یہاں سے اوپر اوپر قاری ہو۔'' سفر حج میں ابا جی کو اطلاع ملی کہ ان کی پھوپھی زاد بہن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے اور اس کا نام بلال رکھا گیا ہے تو انھوں نے اپنے خط میں اس کی مبارک باد دی اور لکھا کہ ''دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحیح معنی میں بلال بنائے، بغیر اس کے کہ وہ کالا ہو۔'' برادرم عبد القیوم طاہر بتاتے ہیں کہ شادی کے بعد کئی برسوں تک ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو وہ ابا جی کے پاس تعویذ کے لیے حاضر ہوئے۔ ابا جی نے تعویذ دیا اور کہا کہ بھئی، تعویذ تو یہ لو، لیکن خود بھی محنت کرنی ہے۔ خود محنت کرتے نہیں اور تعویذ لینے آ گئے ہو! دوران سبق میں بعض دفعہ فرماتے کہ ہر زبان میں کسی آنے والے کے استقبال کے لیے کوئی نہ کوئی خاص کلمہ بولا جاتا ہے، مثلاً عربی میں 'مرحبا' کہا جاتا ہے، فارسی میں کہتے ہیں: ''خوش آمدید''، پنجابی میں ''جی آیاں نوں'' رائج ہے، جبکہ انگریزی میں کہتے ہیں: 'وَیلکُم' (Welcome)۔ ایک موقع پر جنات کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ ہم جنات کو دیکھ نہیں سکتے، لیکن جہاں ہم بیٹھے ہیں، وہاں انسانوں سے زیادہ جنات موجود ہیں، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کی شکل میں آ کر ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں۔ اب یہ آپ دیکھ لیں کہ وہ آپ میں سے کون کون ہیں! ان کے سامنے کسی عیسائی کا یہ اعتراض ذکر کیا گیا کہ شیطان کے حملوں سے بچاؤ کے لیے ہمارے پاس تو خدا کے بیٹے کا سہارا ہے، تمھارے پاس کیا ہے؟ ابا جی نے کہا کہ اس سے کہو: ''تہاڈے کول پتر اے تے ساڈے کول پیو اے۔''

اباجی کے نزدیک دین کی خدمت کا اہم ترین ذریعہ تعلیم وتعلم اور درس وتدریس تھا اور وہ اسی کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ والد گرامی بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر انھوں نے اپنے ذرائع آمدن بڑھانے کے لیے کچھ دوستوں سے قرض لے کر کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے افتتاح کے موقع پر دعا کے لیے اباجی کو دعوت دی۔ اباجی آئے، افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے اور دعا بھی کی، لیکن متعدد وجوہ سے یہ کاروبار چل نہ سکا اور خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ والد گرامی نے اس صورت حال سے اباجی کو آگاہ کیا اور عرض کیا کہ میں نے آپ سے کاروبار کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست کی تھی، لیکن لگتا ہے کہ آپ نے دعا نہیں کی۔ اباجی نے فرمایا کہ تم بالکل درست سمجھے ہو۔ میں تمھارے کہنے پر آیا تھا اور دعا کے لیے ہاتھ بھی اٹھائے تھے، مگر دعا نہیں کی تھی، اس لیے کہ میں نے تمھیں سالہا سال تک دینی تعلیم کاروبار کرنے کے لیے نہیں دلوائی تھی، بلکہ اس لیے پڑھایا تھا کہ قناعت سے کام لیتے ہوئے دین کی خدمت کرو۔

عم مکرم قاری محمد اشرف خان ماجد مرحوم نے ایک موقع پر یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ کراچی جا کر ٹرک ڈرائیور بننا چاہتے ہیں اور اس سے انھیں ایک ہزار روپے ماہانہ آمدن ہوگی۔ اباجی نے انھیں سختی سے ڈانٹ دیا اور انھیں پابند کیا کہ وہ یہیں کسی مسجد میں بیٹھ کر قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ عم مکرم مولانا رشید الحق خان عابد کے تعلیم وتدریس کے سلسلے سے الگ ہو جانے کا انھیں شدید قلق تھا اور وہ کئی دفعہ اس تاثر کا اظہار کیا کرتے تھے کہ تعلیم وتدریس میں ان بھائیوں میں سب سے زیادہ لائق وہی تھا، لیکن افسوس کہ وہ اس لائن کو ہی چھوڑ گیا ہے۔ والد گرامی کو 'الشریعہ' کا ڈیکلریشن ملا تو اکتوبر ۱۹۸۹ء سے اس کی باقاعدہ اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں ان دنوں بائیبل اور مسیحی لٹریچر کے مطالعے سے دلچسپی رکھتا تھا۔ والد گرامی کی تحریک پر میں نے عیسائیت کے حوالے سے بعض مضامین لکھے جو الشریعہ میں شائع ہوئے۔ یہ میرا درجہ خامسہ کا سال تھا۔ اباجی نے یہ مضامین پڑھے تو ایک چٹ لکھ کر مجھے بھیجی (جو افسوس ہے کہ مجھے اپنے کاغذات میں نہیں ملی)۔ مضمون کم وبیش یہ تھا کہ ''میں نے تمھارے مضامین دیکھے ہیں۔ دیکھو، ملک چیخنے چلانے والوں سے بھرا پڑا ہے جبکہ مدرس علما کی کمی ہے۔ تم ماشاء اللہ ذہین بھی ہو اور محنتی بھی، اس لیے فی الحال لکھنے لکھانے کا سلسلہ ترک کر کے پوری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرو۔'' یاد نہیں کہ اس نصیحت کا مجھ پر کیا اثر ہوا تھا، لیکن عملاً یہی ہوا کہ میرا لکھنے لکھانے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس کے بعد تقریباً پانچ سال تک میں نے کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھا۔

دوران تعلیم میں وہ کسی بھی قسم کی ایسی سرگرمیوں کے سخت خلاف تھے جو تعلیم میں حارج ہوں۔ طلبہ کو سختی کے ساتھ

تاکید کیا کرتے تھے کہ تعلیم کا کام تبلیغ سے زیادہ اہم ہے، اس لیے دوران سال میں تعلیم چھوڑ کر تبلیغ کے لیے جانا ہرگز درست نہیں، البتہ چھٹیوں میں ضرور تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت لگانا چاہیے۔ ایک موقع پر جماعت کے بزرگ راہ نما حضرت مولانا سعید احمد خان گکھڑ تشریف لائے۔ اتفاق سے میں بھی وہیں موجود تھا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ میں کیا کرتا ہوں اور آیا میں نے اللہ کے راستے میں وقت لگایا ہے یا نہیں؟ میں اس وقت مدرسہ نصرۃ العلوم میں پڑھاتا تھا اور جماعت کے طریقے اور مزاج کے ساتھ طبعی عدم مناسبت کی وجہ اس میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ (اب بارہ تیرہ سال کے بعد اس کے ساتھ دل تو رکھتا ہوں، لیکن چسپی اب بھی نہیں ہے)۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو غالباً خود مولانا سعید احمد خان یا شاید ان کے کسی ساتھی کی طرف سے مجھے ''وصول'' کرنے کی فرمایش کی گئی۔ اس فرمایش پر صاف انکار کرنا میرے لیے مشکل تھا، تاہم ابا جی نے فوراً مداخلت کی اور فرمایا کہ یہ مدرسے میں پڑھاتا ہے اور دوران تدریس میں اس کے یوں چلے جانے سے طلبہ کا نقصان ہوگا، اس لیے یہ اس وقت نہیں جا سکتا، البتہ چھٹیاں ہوں گی تو دیکھا جائے گا۔

کسی بھی معاملے میں دوٹوک بات کہنا اور بالخصوص اگر مسئلہ فقہ اور شریعت کا ہو تو اس میں کسی کی کوئی رعایت نہ کرنا ویسے بھی ان کے طرز فکر اور طرز عمل کا ایک نہایت نمایاں پہلو تھا۔ والد گرامی بتاتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر ابا جی اور صوفی صاحب دیوبند گئے تو اس موقع پر دونوں بزرگ دیوبند کے قبرستان میں اکابر دیوبند کی قبروں پر بھی حاضری دی۔ ابا جی نے تو دعا اور فاتحہ پر اکتفا کی، جبکہ صوفی صاحب آگے بڑھ کر حضرت مدنی کی قبر پر مراقب ہو کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر گزری تو ابا جی نے کہا کہ ''اٹھاایس بدعتی نوں، جھول مار کے بیہ گیا اے۔'' (اٹھاؤ اس بدعتی کو، یہ کیا سر ٹانگوں میں دے کر بیٹھ گیا ہے)۔ ان کے سامنے اس بات کا ذکر ہوا کہ ایک صوفی سلسلے میں ایک خاص طرح کے روحانی عمل کے ذریعے سے، جس میں حبس دم کرنا پڑتا ہے، حالت بیداری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ ابا جی نے کہا کہ جتنی دیر وہ سانس روکتے ہیں، اتنی دیر میں ویسے بھی کچھ نہ کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ عم مکرم مولانا عزیز الرحمٰن شاہد کی روایت ہے کہ ایک موقع پر نماز فجر کے درس میں انھوں نے ذکر کی اجتماعی مجالس کے ''بدعت'' ہونے کا مسئلہ واضح کیا۔ اس پر حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت مولانا عبید اللہ انور تو اہتمام کے ساتھ اجتماعی مجالس ذکر منعقد کرتے ہیں۔ ابا جی نے کہا کہ ہم نے کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھا ہے، مولانا عبید اللہ انور کا نہیں۔

قاضی محمد رویس خان ایوبی صاحب، جو ابا جی کے ہم زلف بھی ہیں، بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر ابا جی گکھڑ سے

مدرسہ نصرۃ العلوم کی گاڑی پر گوجرانوالہ آ رہے تھے تو وہ بھی اپنی اہلیہ محترمہ کے ہمراہ ساتھ بیٹھنے کے لیے آگے بڑھے، لیکن ابا جی نے یہ کہہ کر انھیں روک دیا کہ یہ گاڑی مدرسے والوں نے مجھے لینے کے لیے بھیجی ہے اور میں نے کسی اور کو اپنے ساتھ سوار کرانے کی اجازت مدرسے والوں سے نہیں لی۔ پھر ابا جی نے انھیں اپنی جیب سے کرایہ نکال کر دیا اور کہا کہ آپ بس میں بیٹھ کر آ جائیں۔ ابا جی کے ایک قریبی عزیز، جو کسی سرکاری مسجد میں خطیب مقرر تھے، ان سے ملنے آئے تو ابا جی نے پوچھا کہ آج کل کیا کرتے ہو؟ انھوں نے بتایا کہ کوئی خاص ذمہ داری تو نہیں ہے، بس جا کر تنخواہ لیتا رہتا ہوں۔ ابا جی نے کہا، پھر تو تم بہت حرام خور ہو۔ ایک دفعہ گکھڑ کے ایک قریبی تعلق رکھنے والے گھرانے کی شادی کے موقع پر نکاح کے لیے ابا جی بارات کے ساتھ گئے۔ دولہا ان کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بوتل پی کر عام عادت کے مطابق اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیا اور بوتل نیچے رکھ دی۔ ابا جی نے کہا کہ یہ بوتل اٹھاؤ اور اسے ختم کرو، اور پھر ہچکچاہٹ اور شرمندگی کے باوجود دولہا کو ساری بوتل ختم کرتے ہی بنی۔

ابا جی اپنی آرا اور نظریات میں جمہور اہل علم کے موقف کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کسی بھی علمی یا فقہی مسئلے میں جمہور امت جس رائے کی تائید کریں، وہی اقرب الی الحق اور قرین صواب ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں زیر بحث آنے والے کم وبیش تمام مسائل کی تحقیق میں اسی زاویۂ نگاہ کو ملحوظ رکھا ہے اور اپنے تلامذہ اور متعلقین کو بھی یہی ہدایت کرتے تھے کہ مختلف گمراہ کن نظریات کے اثرات سے بچنے کے لیے جمہور علماے امت کی تحقیقات کا دامن تھامے رکھنا ہی محفوظ ترین اور محتاط ترین راستہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دین کے معاملے میں بزرگوں پر اعتماد کرنے اور عوام الناس میں اس اعتماد کو قائم رکھنے کو بے حد ضروری قرار دیتے تھے اور اس ضمن میں انھیں اگر کسی بات سے علمی نوعیت کا اختلاف ہوتا تو اس کے اظہار میں بھی اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ ۲۰۰۱ء میں ماہنامہ 'الشریعہ' میں میرا ایک مضمون شائع ہوا جس میں، میں نے اس معروف تفسیری واقعے پر سند اور متن کے اعتبار سے نقد کیا تھا جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک موقع پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک منافق کو اس بنیاد پر قتل کر دیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر مطمئن نہیں تھا اور آپ کی عدالت سے فیصلہ سننے کے بعد اپنا مقدمہ سیدنا عمر کے پاس لے کر گیا تھا۔ ابا جی نے یہ مضمون پڑھا اور چند دنوں کے بعد جب میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ تمھاری تنقید درست ہے، لیکن بات یہ ہے کہ یہ واقعہ بہت سی معروف اور متداول تفسیروں میں بیان کیا گیا ہے، جبکہ تمھاری تنقید سے عوام کا اعتماد ان بزرگوں اور کتابوں کے بارے میں مجروح ہوگا۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری الماری

سے تفسیر جلالین کا نسخہ نکالو۔ میں نے کتاب نکالی تو کہا کہ فلاں صفحہ کھولو۔ وہاں انھوں نے کتب تفسیر میں عام طور پر بیان کی جانے والی ایک روایت پر، جس میں ایک معروف صحابی کے اخلاق وکردار منفی رنگ میں سامنے آتا ہے، اپنی تنقید ایک الگ صفحے پر تحریر کر کے رکھی ہوئی تھی۔ اباجی نے لکھا تھا کہ یہ واقعہ دراصل اس معروف اور مخلص صاحب ایمان صحابی کا نہیں بلکہ ایک منافق کا تھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ معروف روایت کی سند میں ایک شیعہ راوی ہے جس نے غالباً صحابی کو بدنام کرنے کے لیے اس واقعے میں ان کا نام ذکر کر دیا ہے۔ اباجی نے مجھ سے کہا کہ میری تحقیق یہ ہے، حالانکہ تمام مفسرین اس واقعے کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، لیکن میں نے کبھی اپنی اس تنقید کو شائع نہیں کیا کہ اس سے اکابر کی تحقیق کے بارے میں لوگوں کا اعتماد مجروح ہو سکتا ہے۔ البتہ میرے سوال پر انھوں نے کہا کہ اس نوعیت کا اختلاف یا تنقید سبق کے دوران میں طلبہ کے سامنے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

تاہم اباجی کا یہ طرز عمل علمی نوعیت کی باتوں میں ہوتا تھا، جبکہ ایسے امور میں جو کسی اعتقادی یا شرعی مسئلے سے متعلق ہوں اور ان سے عوام الناس کے ایمان واعتقاد پر منفی اثر پڑنے کا خدشہ ہو، وہ مذکورہ مصلحت کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر مسئلہ شرعی نوعیت کا ہوتا تو وہ بڑے بڑے علما کے ہاں طبقاً عن طبق چلی آنے والی کسی غلط فہمی کی تردید میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر امام طحاوی کی ایک عبارت سے حنفی فقہا کی ایک بہت بڑی تعداد یہ سمجھتی چلی آ رہی ہے کہ امام صاحب بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینے کے جواز کے قائل ہیں۔ اباجی نے تحقیق کی تو واضح ہوا کہ امام صاحب کا مدعا یہ نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے ''الکلام الحاوی فی تحقیق عبارۃ الطحاوی'' کے عنوان سے ایک مفصل کتاب تصنیف فرمائی۔ اس میں لکھتے ہیں:

''اب ہم ان بعض حضرات کے حوالے بتلاتے ہیں جن کی عبارات ہماری نظر سے گزری ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ امام طحاوی جواز کے قائل ہیں: ۱۔ علامہ عبدالحیٔ اور چند وہ بزرگ جن کے نام مجموعہ فتاویٰ میں درج ہیں، ۲۔ شارح ملتقی الابحر، ۳۔ مصنف النہر الفائق، ۴۔ علامہ برجندی عبد العلی، ۵۔ علامہ شرنبلالی، ۶۔ الیاس زادہ، ۷۔ قہستانی، ۸۔ صاحب العرف الشذی، ۹۔ سید جلال الدین الخوارزمی کرمانی، صاحب الکفایہ شرح ہدایہ، ۱۰۔ اور صاحب فتاویٰ برہنہ وغیرہ''۔ (ص ۹۹)

''طحاوی کے سب باب کو اول سے آخر تک بغور مطالعہ کریں۔ کہیں صراحۃً یا کنایۃً ایک بھی ایسی جزئی نظر نہ آئے گی جس سے یہ سمجھا جائے کہ امام طحاوی جواز کے قائل یا مائل الی الجواز ہیں۔ یہ ان بعض حضرات کی بھیڑ چال تھی سامحھم اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ کہ ایک کو غلطی ہوئی تو پھر دوسرے بزرگوں نے اس کو نقل کرنا شروع

کردیا اور امام طحاوی کے قول 'فبھذا ناخذ' کو محرف کرکے بالجواز ناخذ کردیا جس سے مطلب کیا سے کیا ہو گیا۔'' (ص ۱۰۶)

علمی و فقہی معاملات میں وہ اکابر دیوبند کی تحقیقات کی پابندی کو خاص طور پر ضروری سمجھتے اور اس دائرے سے باہر جانے کو کسی حال میں گوارا نہیں کرتے تھے۔ ۲۰۰۱ء میں 'الشریعہ' میں میرے بعض مضامین شائع ہوئے جن میں، میں نے عبادات اور معاملات سے متعلق بعض فقہی مسائل کے ضمن میں حلقہ دیوبند کے معروف مفتیان کرام کے موقف کے برعکس نقطہ نظر کو علمی طور پر ترجیح دی تھی۔ مجھے اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے مطالعہ و تحقیق اور علمی استفادے کو اہل علم کے کسی مخصوص دائرے تک محدود کر دینے کا فلسفہ بدو شعور سے ہی اپیل نہیں کرتا تھا اور اس کے بجائے ''تمتع زہر گوشۂ یافتم'' کا رجحان میرے مزاج کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ایک موقع پر مدرسہ نصرۃ العلوم کی انجمن طلبہ کے زیر اہتمام ایک تربیتی مناظرے کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع تقلید کا جواز یا عدم جواز تھا۔ مجھے عدم جواز کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس موقع پر دلائل کی ترتیب اور تنقیح کے مرحلے میں جو چیز میرے ذہنی رجحان کی حتمی تعیین میں فیصلہ کن ثابت ہوئی، وہ یہ تھی کہ خود احناف کے ہاں صرف امام ابوحنیفہ کے اقوال کی پابندی نہیں کی جاتی، بلکہ دلیل کے وزن اور عملی ضرورت کے لحاظ سے ان کے تلامذہ کا قول اختیار کرنے کی بھی گنجایش موجود ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ جب ائمہ احناف کی آرا میں اخذ وانتخاب اور ترجیح کی گنجایش موجود ہے تو اس حوالے سے امت کے دوسرے فقہا کو ''اچھوت'' قرار دینے کا کیا جواز ہے؟ بعد میں ایک موقع پر حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ کے اس ارشاد نے میرے اس رجحان کو تقویت دی کہ اگر کوئی شخص علمی دلائل کی روشنی میں دوسرے فقہا کے موقف پر اطمینان محسوس کرتا اور اسے اختیار کرتا ہے تو ایسا کرنے سے وہ حنفیت سے خارج نہیں ہوتا۔ مطالعہ و تحقیق کا دائرہ وسیع ہونے سے ماضی اور حال کے مختلف و متنوع فکری دھاروں سے زیادہ قریبی واقفیت پیدا ہوئی اور بالخصوص استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی صحبت میں آیت من آیات اللہ، ترجمان القرآن حضرت امام حمید الدین فراہی (جن کی قرآنی بصیرت کے اعتراف میں سید سلیمان ندوی، مناظر احسن گیلانی، عبدالماجد دریابادی اور سید ابوالحسن علی ندوی جیسے بلند پایہ اہل علم رطب اللسان ہیں) کے مدرسہ فکر اور قرآنی علوم و معارف میں ان کی تحقیقات و خدمات سے متعارف ہونے کا موقع ملا تو اس رجحان میں مزید پختگی پیدا ہوتی چلی گئی۔

خیر، ابا جی نے 'الشریعہ' میں میرے مضامین پڑھے تو مجھے طلب فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو انھوں نے تنہائی میں محبت

اور شفقت سے بھر پور لہجے میں گفتگو کی۔ فرمایا کہ دیکھو! جب زاہد (والد گرامی مولانا زاہد الراشدی) نے سیاسی میدان میں قدم رکھا اور مختلف نظریات کے لوگوں اور جماعتوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو ہمیں اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ وہ کہیں اپنے بزرگوں (یعنی اکابر دیوبند) کے مسلک سے ہٹ نہ جائے، لیکن الحمدللہ زاہد نے ہمیں اس معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اب تمھارے جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں تم نے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو ہمارے بزرگوں کی تحقیق کے خلاف ہیں، جبکہ ان کی تحقیقات حد درجہ غور وفکر اور احتیاط پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کے علم وفہم کے مقابلے میں میرے اور تمھارے علم یا رائے اور قیاس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اباجی نے اسی نوعیت کی چند مزید باتیں بھی ارشاد فرمائیں۔ ان کی باتیں دماغ کو تو جتنا اپیل کر سکتی تھیں، اتنا ہی کیا، لیکن ان کے محبت وشفقت میں ڈوبے ہوئے لہجے نے، سچی بات یہ ہے کہ دل کو جیسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرا ان سے بحث کرنے کا پہلے بھی ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا اور زیر بحث مسائل بھی بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے تھے، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ آپ جن باتوں کو غلط سمجھتے ہیں، ان کی نشان دہی کر دیں، میں ان شاء اللہ آیندہ شمارے میں وضاحت کر دوں گا۔ اباجی اس پر بے حد خوش ہوئے اور دعا دے کر مجھے رخصت کر دیا۔ بعد میں انھوں نے متعدد بار میرے رویے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بات پر اڑ جائے گا اور بحث کرے گا، لیکن اس نے بڑے برخوردارانہ طرز عمل کا اظہار کیا ہے۔ چند دنوں کے بعد انھوں نے میری تحریروں میں سے بعض مسائل کی نشان دہی کر کے ان کے حوالے سے اپنا موقف بتایا اور فرمایا کہ ان کی وضاحت تم اپنے قلم سے خود لکھو، کیونکہ تم ادیب ہو۔ میری یہ وضاحت 'الشریعہ' کے اگلے شمارے میں ''چند علمی مسائل کی وضاحت'' کے زیر عنوان شائع ہوئی۔

فقہی معاملات میں اباجی کے اس زاویہ نظر کا دائرہ روزمرہ کے عام مسائل تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ اجتماعی سطح پر قانون سازی کے ضمن میں بھی قدیم فقہی ذخیرے کی من وعن پابندی کو ضروری سمجھتے تھے اور اس ضمن میں حالات کے تغیر اور عملی ضروریات کی روشنی میں بھی کسی قسم کی کوئی لچک پیدا کرنے کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ الیکٹرانک میڈیا کو دینی مقاصد کے لیے ذریعہ ابلاغ کے طور پر استعمال کرنے کے حوالے سے ان کا موقف معروف ہے۔ وہ اس کو کوئی دینی ضرورت نہیں سمجھتے تھے اور نہ اس بنیاد پر ''تصویر'' کے جواز کے لیے گنجایش پیدا کرنے کے قائل تھے۔ اسی طرح ایک موقع پر والد گرامی نے انھیں جمعیۃ علماے اسلام کے منشور کا مسودہ تصدیق وتائید کے لیے بھجوایا تو اباجی نے جوابی خط میں لکھا:

''جمعیۃ علماے اسلام کا جو منشور ہے، وہ اپنی کوشش اور اخروی نجات کے لیے ضرور ہونا چاہیے، مگر اس میں بعض

چیزیں تو محض شیخ چلی کے پلاؤ کا مصداق ہیں۔ عملاً ان کا پتا چلے گا، کاغذی کارروائی سے کیا معلوم ہوسکتا ہے؟ اقلیتی فرقوں میں بعض مرتد اور زندیق ہیں، ان کے لیے شرعاً ہم مسلک لوگوں کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی گنجایش کہاں ہے؟ اور پاکستان میں آزادومنصفانہ انتخابات کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ اوراس میں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو قابل فہم اور قابل عمل نہیں ہیں اور '' ۲۲ نکات کی روشنی میں ترامیم کی جائے گی'' کے جملہ کی بھی سمجھ نہیں آتی۔ گویا یہ اس کے رد کے مترادف ہے۔ بینکوں میں مضاربت، سرکاری اداروں کا تعلیمی نصاب اور زکوٰۃ وعشر کے نظام پر نظر ثانی ایک چیستان ہے۔''

افغانستان کے طالبان کے طرز حکومت کی تائید میں انھوں نے جو تحریر لکھی، اس میں یہ بات خاص طور پر نمایاں کی کہ:

''طالبان کو قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے۔ صدیوں سے ہدایہ وغیرہا کی صورت میں ان کے قانون پہلے ہی سے بنے ہوئے ہیں اور قانون سازی کی چپقلش سے وہ فارغ ہیں۔ کتاب نکالی اور فوراً اس کا نفاذ کر دیا۔ جب کہیں کسی نئی چیز میں ان کو ضرورت پیش آئے گی تو بحمد اللہ تعالیٰ جید علماے کرام ان کے ساتھ ہیں جو شوریٰ کی شکل میں اس مشکل کو بھی حل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔''

مجھ جیسے ''تجدد پسند'' اس پر کتنی ہی بے اطمینانی کیوں نہ محسوس کرتے ہوں، لیکن اباجی کا موقف بہرحال یہی تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے وہ پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ اس نکتے کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بلند فکری اور ذہنی معیار رکھنے والے اہل علم اور محققین بسا اوقات کسی مسئلے میں عام رائے پر اطمینان محسوس نہیں کرتے اور ان کا غور وفکر انھیں معروف اور مانوس نقطۂ نظر سے مختلف رجحان اختیار کرنے پر آمادہ کرسکتا ہے، چنانچہ وہ ایسے اہل علم کے لیے جن کی علمی حیثیت مسلم ہو، عام آرا سے اختلاف یا تفرد کا حق بھی پوری طرح تسلیم کرتے تھے، بشرطیکہ اس اختلاف کو علمی حدود میں رکھا جائے اور اس کی وجہ سے جمہور اہل علم پر طعن وتشنیع کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ اپنی کتاب ''سماع الموتی'' میں انھوں نے اپنے اس موقف کی تفصیلاً وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہم نے نہ تو یہ کہا ہے اور نہ ہمارا یہ موقف ہے کہ جمہور شرع کی پانچویں دلیل ہے۔ ادلۃ الشرع صرف چار ہیں، لیکن ان ادلہ اربعہ میں سے جس دلیل کو جمہور بیان کرتے اور اس پر عمل کرتے چلے آئے ہوں، اس کو کوئی بھی دیانت دار اور منصف مزاج عالم کبھی بھی جمہور زنبور کہہ کر ٹرخاتا بھی نہیں رہا اور نہ حضرات جمہور کے خلاف ایسے گندے الفاظ کسی نے زبان وقلم سے نکالے ہیں۔ یہی ہوا ہے کہ جمہور کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھ کر علمی طور پر

دوسرے پہلو کو ترجیح دی ہے۔'' (ص ۵۵) ''حضرت شیخ الہند کا ارشاد بھی صحیح ہے۔ وہ جمہور اور اکثریت کے قول کو تسلیم کر کے راجح اور مرجوح کا فرق اور لفظ ہمیشہ تحریر فرما کر اسے بیان فرماتے ہیں جو ایک خالص علمی اور تحقیقی بات ہے۔'' (ص ۶۱) ''الغرض اختلافی مسائل میں اکثریت اور جمہور کے قول کو اگر معمول بہ نہ بھی بنایا جائے اور کسی معقول اور قوی وجہ سے اس کے مدمقابل قول کو لیا جائے، تب بھی جمہور کو زنبور کہہ کر ان کو ہدف ملامت بنانا بھی تو کسی عالم کا کام نہیں ہے۔'' (ص ۶۳) ''بلاشبہ ہمارے پیر و مرشد قدس اللہ تعالیٰ سرہ اور حضرت شاہ صاحبؒ اور شیخ الہندؒ اور حضرت نانوتویؒ وغیرہ حضرات نے اپنے علم و تحقیق کی بنا پر اپنے تفردات کو بھی لیا ہے، مگر یقین جانیے کہ نہ تو انھوں نے جمہور کو زنبور کہا ہے اور نہ ان کا مذاق اڑایا ہے اور نہ انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ علماء حق کے ہاں جمہور کی حیثیت کیا ہے؟'' (ص ۶۴)

ایسی انفرادی اور اچھوتی آرا کی بنا پر وہ نہ تو ان شخصیات کے مرتبہ و مقام اور احترام میں تقصیر کو گوارا کرتے تھے اور نہ ان کی علمی حیثیت کو کلیتاً مجروح کرنے یا یا ان کی دینی خدمات کی نفی کرنے کو درست سمجھتے تھے۔ وفات سے چند ماہ قبل کی بات ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گفتگو کے دوران میں، میں نے کہا کہ آپ علمی مسائل میں جمہور کی رائے کی پابندی پر بہت اصرار کرتے ہیں، لیکن بہت سے اکابر اہل علم، مثلاً امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ہاں متعدد مسائل میں عام موقف سے ہٹ کر رائے پیش کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ (امام ابن تیمیہ کی ایسی آرا کی تعداد تین درجن کے قریب شمار کی گئی ہے) کیا یہ حضرات جمہور کی رائے کی اہمیت سے واقف نہیں تھے اور کیا ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی منفرد رائے قائم کریں؟ انھوں نے فرمایا، ہاں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ایسا کرنے سے وہ گمراہی کا ارتکاب کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا، نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ایسا کرنے کے باوجود وہ اہل سنت کے دائرے میں ہی رہتے ہیں؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ ابا جی نے اپنی تصانیف میں بھی ہر جگہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ذکر ہر جگہ نہایت ادب واحترام سے ''امام'' اور ''شیخ الاسلام'' وغیرہ کے القاب کے ساتھ کیا ہے۔ ''راہ ہدایت'' میں لکھتے ہیں:

''اکثر اہل بدعت مشہور محدث حافظ ابن تیمیہؒ المتوفی ۷۲۸ھ اور حافظ ابن القیمؒ کی رفیع شان میں بہت ہی گستاخی کرتے ہیں، مگر ملا علی القاری الحنفیؒ ان دونوں بزرگوں کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ .... یہ دونوں اہل السنّت والجماعت کے اکابر میں اور اس امت کے اولیا میں تھے۔'' (ص ۱۲۰، ۱۲۱)

جمہور سے ہٹ کر منفرد آرا قائم کرنے والے سبھی اہل علم کے بارے میں ان کے ہاں یہی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور مورخ ابن خلدون نے تاریخی زاویے سے بعض ایسی روایات پر بھی تنقید کی ہے جو محدثین کے ہاں مستند سمجھی جاتی ہیں، مثلاً حضرت آدم کا قد ساٹھ ہاتھ ہونے کی روایت اور امام مہدی کے ظہور سے متعلق

روایات۔ اس کے باوجود امام اہل سنت نے ہر جگہ ان کا ذکر ''علامہ'' اور ''مورخ اسلام'' کے القاب سے کیا ہے۔ 'تسکین الصدور' میں ابن حزم کی جمہور سے بالکل ہٹی ہوئی ایک رائے بیان کرتے ہوئے اور اسے ''غلط نظریہ'' قرار دیتے ہوئے بھی انھوں نے ان کے لیے ''علامہ'' کا لقب استعمال کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خان کے ہاں مشرک کے ذبیحہ کے حلال ہونے، چار سے زائد عورتوں سے نکاح کے جواز اور نکاح متعہ کی حلت جیسے بہت سے تفردات پائے جاتے ہیں، لیکن ابا جی نے اپنی تصانیف میں بے شمار جگہ پر ان کی آرا کا حوالہ دیا ہے اور صرف الزامی بحثوں میں نہیں، بلکہ خالص تحقیقی امور میں بھی ان کی رائے سے استناد کیا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے بعض تفردات اور شاذ آرا کے تناظر میں ان کی شخصیت حلقہ دیوبند میں خاصے بحث ونزاع کا موضوع ہے اور خود ان کے دفاع میں قلم اٹھانے والے بزرگ، مثال کے طور پر استاذ گرامی حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی نور اللہ مرقدہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ''مرجوح اور شاذ'' آرا موجود ہیں۔ برادرم مولانا مشتاق احمد چنیوٹی نے ایک مکتوب میں اس ضمن میں استفسار کیا تو ابا جی نے انھیں لکھا کہ ''مولانا سندھی کے بعض نظریات سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ان پر کوئی فتویٰ نہیں لگتا۔'' مولانا شبلی نعمانی کے بارے میں مولانا علی میاں کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' میں یہ تبصرہ ایک مرتبہ انھوں نے خود مجھے دکھایا کہ وہ کلامی مسائل میں معتزلی تھے، لیکن اپنی کتابوں میں شبلی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ہر جگہ ''علامہ'' کا لقب استعمال کیا ہے، بلکہ ایک جگہ ''دور حاضر کے مشہور اور معتبر مورخ حضرت مولانا شبلی نعمانی'' کے الفاظ بھی لکھے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بہت سی تفسیری آرا کو اہل علم نے نقد وجرح کا موضوع بنایا ہے اور خاص طور پر مولانا محمد یوسف بنوری نے ان کے اسلوب تفسیر پر شدید تنقید کرتے ہوئے ان کا ذکر سر سید احمد خان اور علامہ عنایت اللہ مشرقی کے ساتھ کیا ہے، لیکن استاذ گرامی مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے ابا جی سے کہا کہ بعض اہل علم مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تو فرمایا: مولانا حسین احمد مدنی کے درس میں ایک طالب علم نے رقعہ لکھا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو برا بھلا کہا گیا تھا۔ حضرت مدنی نے رقعہ پڑھ کر کہا کہ یہ کس گدھے نے لکھا ہے؟ ہمارے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن تحریک آزادی میں مولانا آزاد کی خدمات کو سراہتے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی کی منفرد تفسیری آرا اور رجحانات بھی کسی سے مخفی نہیں، لیکن ابا جی نے ان کا ذکر بھی ''حضرت مولانا امین احسن اصلاحی'' کے الفاظ سے کیا ہے۔ البتہ اختلاف کی بنیاد پر طعن وتشنیع کرنے والے حضرات کے معاملے میں ان کی روش مختلف تھی، چنانچہ مشہور معتزلی نحوی اور لغوی زمخشری کے بارے میں فرماتے تھے کہ وہ لغت اور نحو کا امام ہے، لیکن اہل سنت کے بارے میں سخت تعصب رکھتا ہے۔ پھر بتاتے تھے کہ

ایک جگہ اس نے اپنے مسلک کی وکالت کرتے ہوئے اہل سنت کے بارے میں 'کالحمیر الموکفة' کے الفاظ لکھے ہیں۔ فرماتے تھے کہ جب سے میں نے یہ الفاظ پڑھے ہیں، اس کے بعد سے میں زمخشری کے لیے رحمہ اللہ کا جملہ مستقلاً استعمال نہیں کرتا۔

اسی طرح بہت سے اکابر کے ہاں بعض ایسی آرا اور تعبیرات ملتی ہیں جو بظاہر شرعی نقطہ نظر سے قابل اعتراض اور قابل گرفت ہیں۔ حضرت انھیں قابل اعتراض ہی سمجھتے تھے اور ان کے بے جا دفاع کی روش اختیار نہیں کرتے تھے۔ اپنی تصنیفات میں انھوں نے متعدد جگہ اس ضمن میں اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔ ''دل کا سرور'' میں لکھتے ہیں: ''علماء دین کی غلطیاں اور لغزشیں عین ایمان ہرگز نہیں ہوا کرتیں۔'' (ص ۱۸۱) مزید فرماتے ہیں:

> ''اگر کسی بزرگ کا کوئی قول کسی جگہ مجمل ہے تو ان ہی کی عبارت میں دوسری جگہ اس کی تفصیل بھی عموماً موجود ہے۔ اگر بالفرض اس کی کوئی مناسب تاویل آپ کو نہیں مل سکتی تو قرآن کریم اور احادیث اور اجماع امت کے مقابلے میں ان کی وہ بات مردود ہوگی، نہ یہ کہ اس پر دین کی اور خصوصاً عقیدہ کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔'' (ص ۲۱۹)

میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ کیا صوفیا کا تصور وحدت الوجود قرآن وسنت کے مطابق ہے؟ انھوں نے کہا: ''کھینچ تان کر ہی مطابق بنایا جاتا ہے''، لیکن اس تصور کے سب سے بڑے ترجمان امام محی الدین ابن العربی کا ذکر انھوں نے اپنی تصانیف میں بے حد احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر اس نوعیت کی بعض تعبیرات کے تناظر میں میرے استفسار کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ ہمارا طریقہ بحمد للہ اعتدال کا طریقہ ہے۔ ہم نہ اہل بدعت کی طرح اکابر کی غلطیوں کو مذہب اور مسلک بناتے ہیں اور نہ غیر مقلدین کی طرح انھیں طعن وتشنیع کا ہدف بناتے ہیں۔

مذکورہ امور کی روشنی میں، میرے نزدیک ابا جی کے موقف اور نقطہ نظر کی درست تعبیر یہ بنتی ہے کہ وہ اصولی طور پر جمہور اہل علم کی آرا اور تعبیرات ہی کو درست سمجھتے اور اپنے لیے اس کی پابندی کو بالعموم ضروری تصور کرتے تھے، تاہم اہل علم کے لیے دلائل کی روشنی میں انفرادی رجحانات کا حق بھی تسلیم کرتے تھے اور جمہور سے محض علمی اختلاف کو اہل سنت کے منہج سے انحراف یا گمراہی قرار نہیں دیتے تھے، حتیٰ کہ اگر کسی صاحب علم یا کسی طبقے کی کوئی بات فی الواقع جادۂ صواب سے ہٹی ہوئی اور علمی وشرعی معیارات کی روشنی میں قابل تنقید ہوتی تو اس رائے پر تنقید کے باوجود صاحب رائے کی دینی وعلمی خدمات کی نفی کرنے یا اس کی شخصیت کے مقام اور احترام کو نظر انداز کرتے ہوئے فتویٰ بازی اور

طعن و تشنیع کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک جمہور سے اختلاف کرنے والے اصحاب علم کے معاملے میں یہی مسلک، مسلک اعتدال ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ اصولی رویے کو صرف روایتی مذہبی حلقوں میں معروف اور مانوس اہل علم تک محدود رکھنے کے بجائے کسی بھی علمی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے اصحاب علم کے حوالے سے اس کی پابندی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ابا جی دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی تمام جماعتوں اور تنظیموں کے ساتھ مشفقانہ تعلق رکھتے تھے اور اپنے اپنے دائرے میں ان کی جدوجہد کی کامیابی کے لیے دعا گو بھی رہتے تھے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کی بے اعتدالیوں پر بھی پوری طرح نظر رکھتے اور موقع و محل کی مناسبت سے ان کی طرف توجہ بھی دلاتے رہتے تھے۔

تبلیغی جماعت کے کام کی وہ بڑی قدر کرتے اور اس کے اثرات و نتائج پر خوشی کا اظہار فرماتے تھے، لیکن اس سے وابستہ بہت سے حضرات کے فکری غلو کی بھی واضح طور پر تردید کرتے تھے۔ ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعض کم فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مجموعی طور پر ساری امت پر دعوت الی اللہ لازم ہے، مگر ایسا نہیں ہے بلکہ امر بالمعروف والنہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، یہ تو امت کے ہر فرد کا فریضہ ہے اور یہ کام انفرادی طور پر بھی باحسن وجوہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہر گھر کے سربراہ، ذمہ دار، کفیل، استاد اور صاحب اثر کا کام ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو، بیوی بچوں کو، چھوٹے بہن بھائی اور شاگرد اور زیر اثر لوگوں کو نیکی کرنے کا حکم اور ترغیب دے اور برائی سے منع کرے۔ ...... اس کے لیے اجتماع، اشتہار، منادی اور باہر نکلنا، گشت کرنا اور اکٹھ کرنا ضروری نہیں۔ ایک آدمی بھی یہ کر سکتا ہے اور ایک ایک کو بھی امر و نہی کر سکتا ہے۔ اور دعوت الی اللہ ساری امت پر لازم نہیں ہے۔
> (''دعوت الی اللہ کی ضرورت، اہمیت اور چند اصول''، ماہنامہ نصرۃ العلوم، نومبر ۹۵ء، ص ۱۳، ۱۴)

اسی مضمون میں آگے چل کر فرماتے ہیں:

> ''حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: ...... ''مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ مدرسین و طلبہ پڑھنا پڑھانا چھوڑ دیں بلکہ اس کو اپنے بزرگوں سے پوچھو کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔'' .... جو حضرات نئے نئے تبلیغی بنتے ہیں، ان کو بھی حضرت تھانویؒ کے یہ ارشادات پیش نظر رکھنے چاہییں کہ جو علما یا طلبا درس و تدریس کے اوقات میں باہر نہیں نکلتے تو ان کو حقارت کی نگاہ سے ہرگز نہ دیکھیں، اس لیے کہ وہ بھی مبلغ بلکہ اصل مبلغ ہیں۔ اسلام میں افراط و تفریط اور غلو بری چیز ہے۔'' (ص ۱۵، ۱۷)

افغانستان کی تحریک طالبان کے ساتھ انھیں بہت زیادہ قلبی لگاؤ تھا۔ ملا محمد عمر کی قیادت میں امارت اسلامیہ کے

قیام کے بعد وہ باقاعدہ افغانستان کے دورے پر گئے اور ملا محمد عمر سے ملاقات کی۔ انھوں نے طالبان کی تائید اور حمایت کے لیے ایک باقاعدہ تحریر بھی لکھی جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئی۔ تاہم وہ جہادی تنظیموں کی طرف سے شرعی وفقہی اصول وضوابط سے ہٹ کر کیے جانے والے اعلانات، فتووں اور نعروں کی تائید نہیں کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں کشمیر میں شروع کی جانے والی جہادی سرگرمیوں کی شرعی وفقہی حیثیت کے بارے میں وہ تحفظات رکھتے تھے اور ایک دفعہ دوران سبق میں انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا، لیکن ساتھ یہ فرمایا کہ جو نوجوان مخلصانہ جذبے سے جا کر شہید ہو رہے ہیں، انھیں ان کی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے اجر ملے گا۔ محمد اسلم معاویہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک ملاقات میں انھوں نے اباجی سے پوچھا گیا کہ مولانا مفتی نظام الدین شامزئ صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو چکا ہے، آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ مفتی صاحب کو اس فتوے سے رجوع کرنا چاہیے، کیونکہ ہندوستان میں بھی بڑے بڑے علما موجود ہیں جو وہاں کی صورت حال کو بہتر سمجھتے ہیں۔

سپاہ صحابہ کے متشددانہ طرز عمل کی بھی انھوں نے کبھی تائید یا حمایت نہیں کی، بلکہ اس کی قیادت کے نام ایک باقاعدہ خط لکھ کر انھیں اصلاح طلب امور کی طرف توجہ دلائی۔ ۲۳ رجنوری ۱۹۹۱ء کو لکھے گئے اس خط میں وہ فرماتے ہیں:

> ’’نوجوان جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں بہت کچھ کر اور کہہ جاتے ہیں۔ شدت اور سختی سے کبھی مسائل حل نہیں ہوتے اور نہ قوت اور طاقت سے کسی فرد یا نظریہ کو ختم کیا جا سکتا ہے۔... اس لیے گزارش ہے کہ نوجوانوں کو قولاً اور فعلاً شدت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ روکیں۔ رافضیوں کے کفر میں تو شک نہیں، مگر در ودیوار پر کافر کافر لکھنے اور نعرہ بازی سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔‘‘

مذہبی جماعتوں میں انھیں سب سے زیادہ شکایت مذہبی سیاسی جماعتوں کے قائدین سے تھی اور وہ جمعیۃ علماے اسلام کے راہ نماؤں کے شخصی اختلافات، گروہ بندی کی سیاست اور مفاد پرستی کے طرز عمل سے سخت نالاں تھے۔ ۲۳ رنومبر ۱۹۹۴ء کو والد گرامی کے نام لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ’’جمعیۃ کے دو دھڑے پہلے ہی موجود ہیں اور دونوں کسی نہ کسی بہانہ اور عذر سے حکومت وقت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اور یہ کہا جائے کہ اس کے خصیہ بردار ہیں تو غلط نہ ہوگا اور تم نے یہ فارمولا تیار کیا ہے کہ ’’میں نے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا فارورڈ بلاک قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے‘‘۔ یہی تفریق کی شکل میں تیسرا دھڑا بنے گا اور اس کو

کندھا دینے کے لیے ضرور چند مجنوں مل جائیں گے۔.... دونوں صاحبزادوں کی عداوت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ان کا آپس میں ملنے کا امکان بھی نہیں ہے اوران دونوں کو پہلے تو عہدوں سے الگ کرنا ہی مشکل ہے۔ اگر بالفرض الگ کر بھی دیے گئے تو ہر ایک کے مفاد پرست احباب انھیں سے چمٹے رہیں گے اوران میں سے ہر ایک اس کا مدعی ہوگا کہ اصلی جمعیۃ تو میری ہے، دوسرا دھڑ ا غاصب ہے۔''

غالباً ۲۰۰۲ کے اواخر میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ ایک حد تک معذور ہو گئے۔اس کے بعد انھوں نے کم و بیش سات سال اسی کیفیت میں بستر علالت پر گزارے۔اس دوران میں ان کے روزمرہ کے معمولات کا نقشہ بالکل بدل گیا، تعلیم و تدریس کا سلسلہ منقطع ہوا، مطالعہ اور تصنیف و تحقیق کو جاری رکھنا ناممکن ٹھیرا، اور عوارض کے ہجوم نے انھیں مسلسل ایک صبر آزما صورت حال سے دوچار کیے رکھا، لیکن اگر کسی چیز میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا تو وہ ان کی علمی جستجو اور گردوپیش کے حالات سے باخبر رہنے کا اشتیاق تھا۔گو ان کے لیے علم و تحقیق کے میدان میں بذات خود گرم دم جستجو ہونے کا موقع باقی نہیں رہا تھا، لیکن ان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے اور ان کی گفتگو سننے والا ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ علم کے لیے ان کے تجسس اور اشتیاق کا کیا عالم ہے۔ یہ محرومی ان کے لیے جسمانی صحت کی محرومی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ وہ اپنی صحت یابی کی خواہش رکھتے تھے اور بارہا یہ سوال کرتے تھے کہ کیا میں دوبارہ چل پھر سکوں گا، لیکن ان کی اس خواہش کے پیچھے بھی یہی آرزو کارفرما دکھائی دیتی تھی کہ وہ ایک بار پھر مطالعہ اور تحقیق کا سلسلہ شروع کر سکیں اور کتابوں سے استفادے کے لیے دوسروں کے محتاج نہ رہیں۔ میں جب بھی کبھی حاضر ہوتا اور عیادت کرنے والوں کی آمد و رفت مانع نہ ہوتی تو ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ میں انھیں نئی طبع ہونے والی کتابوں کے بارے میں بتاؤں یا المباری سے کوئی عربی کتاب لے کر اس کے اقتباسات انھیں سناؤں۔فرماتے تھے کہ عربی کی کتابیں سننے کو جی چاہتا ہے، لیکن میرے پاس موجود جو بچیاں مجھے کتاب پڑھ کر سناتی ہیں، وہ عربی نہیں پڑھ سکتیں۔کسی نئی کتاب کے بارے میں بتایا جاتا تو تین باتیں اہتمام سے دریافت کرتے تھے: ایک یہ کہ کتاب کتنی جلدوں میں ہے، دوسری یہ کہ کہاں سے طبع ہوئی ہے، اور تیسری یہ کہ کیا یہ تمھارے کتب خانے میں موجود ہے؟ بعض اوقات بڑی حسرت سے فرماتے کہ جب صحت تھی تو بہت سی کتابیں دستیاب نہیں تھیں، اور اب کتابیں ملتی ہیں تو صحت ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ایک دفعہ میں اپنا لیپ ٹاپ (Laptop) لے کر گیا اور انھیں بتایا کہ اس میں حدیث، تفسیر، فقہ، رجال اور تاریخ کے تمام معروف مآخذ موجود ہیں۔وہ حیرانی سے مختلف کتابوں کے بارے میں پوچھتے رہے اور بعض چیزوں کے بارے

میں فرمایا کہ رجال کی کتابوں میں دیکھ کر مجھے بتاؤ کہ ان کے بارے میں کیا لکھا ہے۔

ابا جی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں نصف صدی تک صحاح ستہ اور بالخصوص صحیح بخاری کا درس دیتے رہے، چنانچہ صحیح بخاری کی محدثانہ خصوصیات ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھیں اور امام بخاری کے استنباطات، احادیث کے اطراف اور دیگر معلومات کے حوالے سے ان کا حافظہ بڑھاپے اور علالت کی اس کیفیت میں بھی قابل رشک تھا۔ اپنے پاس حاضر ہونے والے طلبہ اور علما سے وہ جو مختلف علمی سوال کرتے تھے، ان کا مرکز بھی عام طور پر صحیح بخاری ہوتی تھی۔ ایک دن میری موجودگی میں چند طلبہ حدیث کی سند حاصل کرنے کے لیے آئے تو ابا جی نے ان میں سے ایک دوست سے پوچھا کہ صحیح بخاری میں ثلاثیات کتنی ہیں؟ وہ اس کا جواب نہ دے سکے جس پر ابا جی نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے ''احسان الباری'' میں صحیح بخاری کی ثلاثیات کے مواقع جلد اور صفحہ کے حوالے کے ساتھ درج کر دیے ہیں، لیکن اگر ان روایات کا متن بھی الگ کر کے شائع کر دیا جائے تو طلبہ کو اس سے فائدہ ہوگا۔ ان کی اس فرمایش کی تعمیل میں، میں نے برادرم مولانا وقار احمد (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ) سے گزارش کی اور انھوں نے صحیح بخاری کی ثلاثی روایات کے متن اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ ان روایات کے راویوں کے مختصر تعارف پر مشتمل ایک مختصر رسالہ مرتب کر دیا جسے الشریعہ اکادمی کی طرف سے شائع کر کے دورۂ حدیث کے طلبہ میں تقسیم کیا گیا۔

ابا جی کی وفات سے چند ماہ پہلے ایک ملاقات میں، میں نے ان سے کہا کہ آپ نے ایک مرتبہ دوران سبق میں صالحین کے ساتھ توسل کے جواز کے لیے جو یہ تاویل ذکر کی تھی کہ ''بزرگوں کے ساتھ عقیدت ومحبت بھی ایک نیک عمل ہے اور نیک عمل کا بطور وسیلہ ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جا سکتی ہے''، اس کی کیا ضرورت ہے اور براہ راست نیک لوگوں کی ذات کا حوالہ دے کر دعا کرنا کیوں جائز نہیں؟ ابا جی نے فرمایا کہ ہاں، وہ بھی ٹھیک ہے اور ایک حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ابا جی نے اس ضمن میں 'كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يستفتح بصعاليك المهاجرين' کی روایت کا حوالہ دیا، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقرائے مہاجرین کے وسیلے سے فتح ونصرت کی دعا مانگا کرتے تھے۔ [یہ روایت حافظ مقدسی کی الاحادیث المختارۃ، رقم ۱۵۰۷ اور طبرانی کی المعجم الکبیر، رقم ۸۵۷ میں امیہ بن خالد بن اسید سے مرسلاً مروی ہے، البتہ عام طور پر علما نے اسے فقرائے مہاجرین سے دعا کرانے کے مفہوم میں لیا ہے (قرطبی، الجامع لاحکام القرآن ۲/۲۶۔ سیوطی، الجامع الصغیر، رقم ۸۷۵) جو توسل بالذات سے مختلف صورت ہے۔]

ایک دن میں نے ان کی بیماری کے پیش نظر ان کا دل بڑھانے کے لیے عرض کیا کہ سنا ہے کہ نیک لوگوں کو آخری عمر میں علالت اور معذوری کی جس کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ ان کے لیے رفع درجات کا ذریعہ بن جاتی ہے، کیا یہ بات درست ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ سامنے کی الماری کے فلاں شیلف میں فلاں کتاب رکھی ہے، اس کی دوسری جلد کا صفحہ نمبر ۸ کھولو۔ میں نے وہ صفحہ کھولا تو وہاں اسی مضمون کی حدیث موجود تھی۔ (اپنا حال یہ ہے کہ اب کتاب کا نام بھی ذہن میں نہیں رہا) پھر انھوں نے پوچھا کہ یہ روایت کس صحابی سے مروی ہے اور کس کتاب کے حوالے سے نقل کی گئی ہے؟ میں نے بتایا کہ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ راوی ہیں اور مسند احمد میں روایت ہوئی ہے۔ انھوں نے مجھے مسند احمد کی متعلقہ جلد بتائی اور کہا کہ اس میں عبداللہ بن مغفل کے مسند میں یہ روایت تلاش کرو۔ میں نے تلاش کر کے بتائی تو اس کا صفحہ نمبر پوچھا۔ میرے بتانے پر انھوں نے صفحہ نمبر دہرایا اور اسے گویا اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ ایام علالت میں ہی چند دنوں کے لیے گوجرانوالہ، عم مکرم مولانا عبدالقدوس خان قارن کی رہایش گاہ پر تشریف لائے تو یہاں بھی مدرسہ نصرۃ العلوم کی لائبریری سے مختلف کتابیں منگوا کر سنتے رہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھویں جلد انھوں نے اسی موقع پر منگوائی اور مجھ سے کہا کہ اس کے فلاں صفحہ پر دیکھو، مولانا شبلی نعمانی کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ میں نے وہ صفحہ کھولا تو وہاں علی میاں کا یہ تبصرہ درج تھا کہ شبلی، کلامیات میں معتزلہ کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ علم، مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ ان کا اشتغال آخر وقت تک قائم رہا اور اس معاملے میں بحمد اللہ ان کی یادداشت بھی پوری طرح قائم رہی۔ یہ سلسلہ غالباً وفات سے چند ہی دن قبل منقطع ہوا۔ والد گرامی سعودی عرب کے حالیہ سفر سے ان کی فرمایش پر مسند ابی یعلیٰ کا نسخہ لائے تھے۔ انھوں نے کتاب پیش کی تو ابا جی نے اشارے سے فرمایا کہ اسے الماری میں رکھ دیا جائے، لیکن غالباً انھیں اس سے استفادہ کا موقع نہیں مل سکا۔

مارچ کے آخر یا اپریل ۲۰۰۹ کے شروع کی بات ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ابا جی اپنی صحت کے زمانے کی طرف واپس لوٹ چکے ہیں اور اسی طرح ہشاش بشاش اور متحرک ہیں جیسے وہ اپنی علالت سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ پھر اسی خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں نے ابا جی کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا ہے اور ابا جی مجھے اس کی تعبیر یہ بتاتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب میں جلد دنیا سے چلا جاؤں گا۔ ابا جی کو خواب کی تعبیر کے فن میں جو غیر معمولی درک حاصل تھا، یہ شاید اسی کا ایک نمونہ تھا کہ خواب میں بتائی ہوئی ان کی تعبیر بھی بالکل درست ثابت ہوئی اور اس کے لگ بھگ ایک ماہ کے بعد ۴ اور ۵ مئی کی درمیانی شب کو سوا بجے کے قریب وہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

میری ان سے آخری ملاقات والد گرامی، والدہ محترمہ اور اپنی فیملی کے ساتھ اس سے تین روز قبل جمعۃ المبارک کے

دن ہوئی۔ اس وقت وہ کھانا پینا اور گفتگو کرنا کم وبیش بند کر چکے تھے، البتہ یادداشت قائم تھی اور بہت اصرار پر ایک آدھ لفظ میں بات کا جواب دیتے تھے۔

علالت کے ان سات آٹھ برسوں میں گھر کے لوگوں میں سے بطور خاص عم مکرم مولانا منہاج الحق خان راشد اور ان کے اہل خانہ، ہماری چھوٹی پھوپھی اور ان کی بیٹیوں اور وقتاً فوقتاً برادرم ممتاز الحسن احسن اور برادرم سرفراز حسن حمزہ نے جبکہ اباجی کے مخلص معتقدین میں سے حاجی لقمان میر صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد نواز بلوچ نے اپنی اپنی بساط اور توفیق کے مطابق ان کی پرخلوص خدمت کی اور ان کی دعاؤں سے وافر حصہ پایا۔ جنازے کے موقع پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بلک بلک کر روتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے حقیقی والد فوت ہو گئے ہوں۔ ان سب حضرات کے لیے بے پایاں اجر، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص، محبت اور عقیدت کے ساتھ صحیح معنوں میں اباجی کے لیے صدقہ جاریہ بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین
